قطرہ قلزم

افتخار احمد افتخار

افتخار احمد افتخار

رہائش؛ ڈنگہ ضلع گجرات تحصیل کھاریاں

فون نمبر: 03006281898

ای میل ایڈریس؛ ift1167@gmail.com

نام کتاب ؛ قطرہ قلزم

سنہ تحریر؛ 2020ء

اہتمام؛ kitbosunnat.com

مطالعے کے لیے؛ kitbosunnat.com (محدث لائبریری)

کمپوزنگ وڈیزائنگ؛ افتخار احمد افتخار

علم کیا ہے؟

علم کے مختلف نظریات؟

علم کے مروجہ اختلافات؟

علم کے ارتقائی مراحل؟

علم کے فلسفیانہ نظریات؟

علم کے جاہلانہ نظریات؟

علم کے صوفیانہ نظریات؟

علم کے اسلامی نظریات؟

جیسے موضوعات پر اس کتاب میں قلم اٹھایا گیا ہے۔

افتخار احمد افتخار

انتساب

راہ علم کے مسافروں کے نام

حرفِ آغاز

علم ایک قلزم ہے اور قطرہ قلزم وہ ہے جو انسان کو عطا کیا ہے مگر خالق کی طرف سے عطا کردہ اس ایک قطرے کی بنا پر انسان نے کیسے کیسے نظریات اور کیسے کیسے تخیلات وضع کیے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ انسان کے شعوری ارتقا ء پہ ایک نظر دوڑائیں تو ہم جانیں گے کہ شروع دن سے انسان نے اپنے علم کی نگاہ اپنی بقا اور بود و باش پہ مرکوز رکھی ہے۔سماجی ارتقاء کے اس عہد کا آدمی ایک مذہبی آدمی تھا۔اگرچہ اسے خالق کا مکمل ادراک تو حاصل نہ تھا۔ مگر وہ اپنے اندر کسی خالق کی پیروی کا داعیہ ضرور محسوس کرتا تھا۔ اس لیے اُس نے اپنے اس جذبے کی تسکین کے لیے اپنی عقلی استعداد کے مطابق معبود گھڑ لیے تھے ۔ یہی وہ

اولین معاشرہ ھے جس میں مبادیات مذاھب کی ابتدا ء ھوئی - پھر صدیوں انسان اپنے مذھبی جذبات کی تسکین اسی طرح کرتا رھا - مگر جب انسان نے فصلیں اگانا سیکھ لیا اور اُن کے ھاں ذاتی تصرف کے ذوق کی ابتدا ھوئی تو وہ انسان جو آج تک صرف جانوروں کو مارتا تھا اب اُس نے اپنے ھی طرح کے انسانوں کے خون سے ھاتھ رنگنا شروع کر دئے-

صدیوں پہ صدیاں گزرتی رھیں انسانوں کے گروہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رھے -تمدنی اور سماجی حوالے سے بے پناہ تبدیلیوں کے باوجود انسان کے مابین کشمکش میں کوئی کمی نہ ھوئی -اول اول تو انسان صرف خوراک کے حصول کے لیے ایک دوسرے کا خون بھاتا رھا- اس سے اگلے عھد میں انسان کچھ نظریات کا اسیر ھوا اور جو اُس کے نظریہ علم سے الگ رھا وہ اس کا دشمن سمجھا گیا اور اس بنا پر انسانوں میں خونریزی کی ابتدا ء ھوئی - زراعت کے عھد کے بعد انسان صنعت کے عھد میں داخل ھو اجس سے وہ سائنس اور علمی نظریات کے عھد تک پھنچا -

اٹھاوریں صدی تک انسان متعدد علمی نظریات کو اپنا کر انھیں رد کر چکا تھا - انیسویں اور بیسویں صدی میں انسانی شعور اپنی بلندیوں کو پھنچا اور اُس نے دنیا کو نت نئے علمی نظریات سے روشناس کرایا -ان صدیوں کو بلا شبہ علم کی صدیاں قرار دیا جا سکتا ھے - اگرچہ آج بھی انسانی معاشروں میں اکثریت مذھبی معاشروں کی ھے مگر اس کے متوازی الحادی نظریات پہ قائم معاشرے بھی اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود ھیں اور اپنے نظریات کا پرچار پورے تیقن کے ساتھ کرتے ھیں- آج کا عھد مختلف علمی نظریات میں منقسم ھو چکا ھے اور لوگ اپنے نظریات کو حرف آخر

قرار دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ۔ مختلف اقوام اور خطہ ارض کے مختلف بر اعظموں میں بسنے والے لوگوں کا علمی تفاوت ہی ہماری اس کتاب کا موضوع ہے ۔ کہ کہیں تو دولت کی متوازی تقسیم میں انسان کی فلاح کو کھوجا گیا ہے تو کہیں سرمایہ دارانہ ذہنیت کو دنیا کے لیے فائدہ مند قرار دیا گیا ہے ، کہیں ڈارون ازم کے چرچے ہیں تو کہیں فرائیڈ کے جنسی نظریات کی پیروی ہے ،کہیں مارکس کے تصور زیست کو الٰہامی قرار دیا جا رہا ہے تو کہیں مادی الحاد کے سائے گھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تودنیا کی ایک بڑی آبادی الٰہامیات کو راہ نجات قرار دیتی ہے ۔ انہی مختلف نظریات کی علمی کشمکش کو زیر بحث لاتے ہوئے ہم نے مروجہ علمی تشریحات کا جائزہ لیا ہے اور اس بات کا فیصلہ قاری پہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ علم کے کس پہلو کو اپنی زندگی کے لیے اختیار کر تا ہے ۔

افتخار احمد افتخار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست عنوانات

نوائے عصر

نوائے عصر خامشی کی اِک صدا ہے جن ساعتوں نے اِس کو سن کو لیا وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوئے ۔ جنھوں نے اس پہ کان نہ دھرے رسوائی کے مہیب سائے اُن کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ نوائے عصر قدرت کا وہ مخفی پیغام ہے عقل و دانش جس کے اسرار افشا کرتی ہے۔ یہ وہ صدائے لامکاں ہے جس میں تخلیق کائنات کے سربستہ راز ہیں، عقل احساس و شرف کا وہ سرمایہ ہے جو اِس صدائے لامکاں کی پہنائیوں سے رازِ زیست کشید کرتی ہے۔ صدائے عصر مختلف خطوں اور مختلف اقوام کے حالات کے تحت مختلف ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ کسی ایک عصر میں کوئی ایک ہی قوم یا امت منصبِ سیادت پہ فائز ہوتی ہے۔ کوئی دوسری قوم اپنی سحر گم کشتہ کی تلاش میں سرگراں ہوتی ہے، راہ جستجو پہ متعین ہوتی ہے۔ تختۂ ارض پہ لوگوں کی کثیر آبادیاں ہیں جن کو مہذب ہونے کا دعویٰ ہے۔ اگرچہ کچھ دوسرے لوگوں کو اُن کے مبادی تہذیب اور مظاہر تمدن سے اختلاف ہے۔ اختلافات کی یہ خلیج نہایت گہری ہے جس کی بنا طبقاتی تقسیم اور معاشی حوالوں پہ رکھی ہے۔

چنانچہ مغرب نے جسے موجودہ عصر کی سیادت کا دعویٰ ہے تیسری دنیا کا وہ تصور پیش کیا جو اُس کے خیال میں معاشی، سماجی، تمدنی اور عسکری حوالوں سے مغرب سے کم تر ہے۔اسی تصور نے لوگوں کو مغرب سے دلبرداشتہ کیا اور اُن کی سیادت کو دل سے قبول نہ کیا گیا۔اگرچہ عملاً مغرب کی بالادستی زیست کے بہت سے حوالوں سے فی الوقت ناپختہ ہے۔لوگوں میں دوسرا بڑا اختلاف طورِ زیست کو متعین کرنے میں ظاہر ہوا۔یہ اختلاف قدیمی ہے تاہم جب مغرب نے خدا سے بیزاری کا اظہار کیا تو پھر سے لوگوں کے دو گروہ وجود میں آ گئے۔

اولاً وہ جو کسی خالق کی موجودگی کے بغیر اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا محسوس کرتے تھے اور خالق کے وجود کے قائل تھے۔ثانیاً انسانوں کا وہ گروہ ہے جو مادیت کو دنیا کی سب سے بڑی حقیقت قرار دیتا ہے اور زندگی کی تعیش کا حصول ہی اس کے نزدیک مقصد زیست ٹھہرا۔اس نظریاتی ٹکراؤ نے مختلف تہذیبی پس منظر وضع کیئے، سماجی، اخلاقی اور تمدنی پہلوؤں سے اختلاف کی خلیج وسیع تر ہوتی رہی۔خطہ ارض پہ بسنے والے لوگوں میں تیسرا بڑا اختلاف تکوین عالم کی توجیہہ کرنے میں پیش آیا کہ ایک انسانی گروہ کا خیال ہے کہ یہ کارخانہ حیات یونہی محض ایک اتفاق سے وجود میں آ گیا تھا اور اس کے بعد سے زمانہ اپنے محور کے گرد گھوم رہا ہے۔وہ حیات کی ابتداء اور انتہا کے بارے میں مبہم سے تصورات پیش کرتے ہیں عقل جنھیں رد کرتی ہے۔

اُن کے خیال میں نہ کوئی خالق ہے اور نہ کسی حیات کو مخلوق قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی خاص امر کو مقصدِ زیست کے طور پہ اپنایا جا سکتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اجزائے عناصر فضائے بسیط میں ازل سے بے مقصد بھٹکتے پھرتے ہیں، حسن اتفاق سے اگر انھیں متناسب ترتیب کا موقع مل گیا تو اُن کے ملاپ سے کوئی نیا عنصر وجود میں آ گیا، یہ نئے عناصر یونہی قرنوں تک بھٹکتے رہے اس کے بعد انھیں کبھی اتفاقیہ موزوں ماحول اور متناسب قربت راس آئی تو حیات پیدا ہو گئی۔حیات کو جب تک سازگار ماحول دستیاب رہا حیات پروان چڑھتی رہی۔انھیں عناصر کی شکست و ریخت کو انھوں نے موت کا نام دیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ مقصد اور ارادے کا تصور انسان کی اپنی خوش فہمی ہے۔حقیقت میں جب

کوئی خالق ہی نہیں تو مقصد اور ارادے کو تلاش کرنا بے محل ہے۔ چنانچہ فلاسفہ کے اس گروہ نے جو تصور انسان کو منتقل کیا اُس میں کسی مابعد الطبیعاتی نظام کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی مگر انسانوں ہی کے ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جس نے ایک متعین مقصد کے تحت اس کائنات کو پیدا کو کیا ہے اور انسان اس کائنات کی سب سے اعلیٰ مخلوق ہے جو براہ راست خالق کی راہنمائی کی محتاج ہے۔ وہ کائنات کو خالق کے دستِ قدرت کا کرشمہ قرار دیتے ہیں اور نظم کائنات کو اس قدرت قاہرہ کے ماتحت تصور کرتے ہیں جو اصلاً اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور اس کا مالک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے انسان نے شعور حاصل کیا ہے تب سے ہی اس گروہ انسانی کو اکثریت حاصل رہی ہے جو سر کائنات خالق کے وجود کا قائل ہے۔ دوسرا گروہ بھی اگرچہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے مگر وہ ہمیشہ اقلیت میں ہی رہا ہے۔

تکوین عالم پہ ہر دور میں قیاس آرائیاں جاری رہی ہیں اور انسان نے اپنی عقلی استعداد کے مطابق اس کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر دانش ور نے کچھ نہ کچھ سوچا ہے۔ اس ضمن میں کئی نظریات قائم کئے گئے جو شعوری ارتقاء کے ساتھ رد ہوتے رہے یہاں ہم صرف اُن نظریات کو جگہ دیں گے جو آج تک نہ صرف یہ کہ انسانوں کے کسی گروہ میں مروّج ہیں بلکہ قائم ودائم ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم اُن نظریات کو قلم انداز کریں گے جن میں کائنات کی توجیہ میں افسانہ گوئی کا عکس پایا جاتا ہے اور جنھیں سنجیدہ غور وفکر میں کبھی کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔

چنانچہ لوگوں کے ایک گرہ نے کہا کہ یہ کائنات کچھ دیوتاؤں کی محض دل بہلائی کا سامان ہے اور کچھ نہیں۔

✡✡✡✡✡✡

لاکھوں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کائنات خیر اور شر کی دو قوتوں کی کرشمہ سازی ہے اور یہ

تماشا گاہ عالم اُن کی ازلی کشمکش کی جولاں گاہ ہے اور کچھ نہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ہمارے ہمسائے ہندوستان کے باسیوں کا خیال ہے کہ یہ کائنات تین بڑی طاقتوں میں منقسم ہے یا یوں کہہ لیں تین دیوتا اس کائنات پہ متصرف ہیں۔ اُن میں سے ایک روحوں کو پیدا کرتا ہے، دوسرا اِن ارواح کو جسموں میں داخل کر کے انھیں قائم کرتا ہے یعنی حیات کو جاری کرتا ہے، ارواح کو آوا گون کے چکر میں ڈالتا ہے اور انسان کے گذشتہ جنم کے اعمال کے بدل میں اسے نئی صورت عطا کرتا ہے۔ بداعمال لوگوں کو اگلے جنم میں گدھا یا کتا بھی بنایا جاسکتا ہے اور یوں عمل تناسخ جاری رہتا ہے۔ تیسرا دیوتا فنا کا دیوتا ہے جو ارواح کو جسم کے چنگل سے آزاد کراتا ہے اور انھیں جہنم (نرک) یا جنت یعنی (سورگ) میں داخل کرتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

اربوں لوگوں نے تکوین عالم کی یہ توجیہ کی ہے کہ خدا ایک بھی ہے اور تین بھی یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس۔ وہ کہتے ہیں خدا نے آدمؑ کو پیدا کو کیا اور پھر اُن کی بیوی حوا کو پیدا کیا اور انھیں جنت میں داخل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت کی کہ وہ آسودگی اور آسائش کے ساتھ زیست کریں اور جنت کے میووں میں سے جو چاہے کھائیں مگر صرف شجر ممنوعہ سے دور رہیں۔ شیطان نے آدم کی بیوی کو بہکایا کہ تمھارے خاوند کو تو ابدی جوانی و حیات سے نوازا گیا ہے مگر تمھیں اس سے محروم رکھا گیا ہے اگر تم اُس درخت کا پھل کھالو تو تمھیں بھی ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ حوا کے اصرار پہ آدم اور حوا نے اُس شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا جس سے اللہ نے انھیں منع کر رکھا تھا۔ انھوں نے حکم الٰہی کی نافرمانی کی جس کی بنا پہ انھیں جنت سے نکال دیا گیا۔ جب وہ زمین پہ پہنچے اور اُن کی اولاد ہوئی تو وہ اولاد گناہ کا خمیر اپنی ذات میں

لے کر پیدا ہوئی جس کی وجہ سے تمام اولادِ آدم گنہگار تصور ہوگی کہ آدم کی نسل قیامت تک اس موروثی گناہ سے نجات نہیں پاسکتی۔ اب خدا تو اپنی صفت انصاف کی وجہ سے مجبور تھا کہ وہ انسان کو اُس کے گناہ کی سزا دے لیکن اُس کی رحمت اُس کے قہر پہ غالب آ گئی اور اُس نے انسان کی نجات کا ایک راستہ کھوج نکالا جس میں اُس کا انصاف بھی متاثر نہ ہو اور ابن آدم سزا سے بھی بچ نکلے۔ چنانچہ اُس نے روح القدس کے ذریعہ سے کنواری مریم کو حاملہ کیا اور خدا کا بیٹا (حضرت عیسیٰؑ) آدم کی اولاد کی شکل میں پیدا ہوا۔ بڑا ہو کر خدا کا یہ بیٹا انسانی گناہوں کے کفارے میں سولی چڑھ گیا۔ یوں خدا کا وہ انصاف جو ٹل نہیں سکتا تھا اور رحم جو نسل انسانی کی بقاء کے لیے مضطرب تھا نے یکجائی کی اور اس طرح تکوین عالم کے مقصد کا متعین ہو گیا جس کا مقصد آدم کی لغزش کا کفارہ اور خدا کی رحمت کا ظہور تھا۔

✡✡✡✡✡✡

قبل ازیں یونانی فلاسفہ نے بھی کائنات کی توجیہ کرنے کی کئی کوششیں کیں اور مختلف فلاسفہ نے کئی آراء کو لوگوں کے سامنے رکھا۔ تب یونان میں فلسفہ کا راج تھا اور علم فلسفہ چیزوں کی ماہیت پہ غور کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اشیاء کے ظاہر سے گزر کر اس کے باطن تک پہنچنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کائنات کی یہ عظیم ماہیت اُس دور کے فلاسفہ کا سب سے اہم موضوع رہی ہوگی۔ یونانی فلاسفہ نے کائنات اور زندگی کی جو تشریح کی اگرچہ وہ ایک عرصہ تک انسانی ذہنوں پہ حاوی رہی۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ اہل فلسفہ کی پانچ ہزار سالہ جہد وسعی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور کوئی فلسفی کائنات اور حیات کے راز کی تہہ تک نہ پہنچ سکا جس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ خود اہل فلسفہ اپنے افکار میں ارتقاء کا شکار رہے اور متفرق نظریات پیش کرتے رہے جس سے لوگوں کا اعتماد متزلزل ہوتا رہا۔ یونان کا معاشرہ شدید طور پہ ایک مذہبی معاشرہ تھا مگر اُن کے فلاسفر اُس مذہبی دیومالا پہ ایمان لانے کو قطعی تیار نہ تھے جس کی بنیاد عقل کی بجائے توہم اور تخیلات پہ رکھی تھی۔ اس لیے یونان کے فلاسفہ نے مذہب کو ایک

طرف رکھ کر کائنات کی عقلی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مذہب کو توہم قرار دیا اور مذہب بیزاری کے اُن افکار کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا جن کا عکس آج کے مغربی معاشرے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یونانی فلاسفہ نے تکوین عالم کی جو توجیحات کیں کسی حد تک اُن کے معاشروں نے اُنھیں قبول کیا جس کی بنا پہ ارتقاء کے اُس سفر کا آغاز ہوا جس نے سب سے پہلے اُن کے تصورِ معبود کو تبدیل کیا۔ ازاں بعد اُن کے عقائد اور اطوارِ زیست میں بھی نمایاں تبدیلی دیکھنے میں آئی اور وہ مذہبی دیو مالا کے اثرات سے بتدریج دور ہٹتے گئے۔ پھر جب مادیت پسندی اور سائنس نے خدا کے عدم وجود پہ زور دینا شروع کیا تو وہ مذہب کے اثرات سے مکمل طور پہ آزاد ہو گئے۔ اس لیے کہ اُن کے فلاسفہ نے حیات اور کائنات کی جو تشریحات اُن کے سامنے پیش کی تھیں اُن میں کہیں بھی کسی خالق کے وجود کی کوئی گنجائش نہ نکلتی تھی اور جب کوئی خالق ہی نہ ہو تو مخلوق کو کیا پڑی ہے کہ وہ کسی ان دیکھے معبود کی پرستش کرتی رہے۔ چنانچہ فیساغورث، ہیرکلیتس، پارمی نائیدس، زینوفنیس اور افلاطون کے افکار میں جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ کائنات محض ایک مادی وجود ہے جس کے لیے کسی خالق کے وجود کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ تاہم ذہن میں رہے کہ اِن فلاسفہ نے کبھی خدا کا مطلق انکار نہیں کیا بلکہ بعض نے تو اثبات کیا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہب اُن کا موضوع ہی نہ تھا۔ اُن کا موضوع فلسفہ تھا جس کی بنا پہ انھوں نے کائنات کی جو تشریح کی وہ سراسر مادی تھی۔ اس لیے یونانی فلسفہ کو مادیت کی بنیادیں فراہم کرنے کا مکروہ اعزاز بھی حاصل ہے۔

اگر چہ خود یونانی فلاسفہ روحانیت کے انکاری نہ تھے مگر سولہویں اور سترہویں صدی میں یونانی فلاسفہ کے افکار کی جو تشریحات دورِ جدید کے مغربی فلاسفہ نے کیں اُس میں انھوں نے روحانیت سے مطلق انکار کیا اور کائنات کی مادی تشریح کو ازسرِنو فروغ دیا۔ اِن صدیوں میں اہلِ مغرب کلیسا کے جبر سے نجات حاصل کرنے کے عمل سے گزر رہے تھے اور اُن کے فلاسفہ اور سائنس دان ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ کسی طرح لوگوں کو مذہب سے بیزار کر دیا جائے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں

مذہب سے وابستہ رہ کر کوئی انسان ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اہل مغرب میں فلاسفہ اور سائنس دانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو نہ صرف مذہب بیزار تھا بلکہ متحرک بھی تھا۔ چنانچہ انھوں نے مذہب کو لوگوں کا ذاتی معاملہ بتایا اور اُن کی راہنمائی سائنس اور مادیت کی اُن منزلوں کی طرف کی جن میں اُن کو روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اُن کے پاس مسلمانوں کا چھوڑا ہوا وسیع علمی سرمایہ موجود تھا کہ مسلمان اپنے ہزار سالہ عروج کے بعد زوال کی منزلوں میں تھے اور اس قابل بھی نہ تھے کہ اپنے علمی اثاثوں کی حفاظت ہی کر سکتے۔

چنانچہ مغرب نے کلیسا سے نجات حاصل کی اور مذہب بیزاری کی راہ پہ چل دیا۔ اُن کی راہنمائی کے لیے بہت سے صاحب دانش موجود تھے جنھوں نے اپنی قوم کی سمت کا تعین کیا۔ اِن دو تین صدیوں میں انھوں نے بہت سے اہل علم کو جنم دیا جن میں فرانسس بیکن، تھامس ہابس، ڈیکارٹ، جان برکلے سپینوزا، جان لاک، ڈیوڈ ہیوم، جیکو روس، عمانویل کانٹ، شوپنہائر، فریڈرک نٹشے، اگسٹ کومٹ ہربرٹ سپنسر اور برٹرنڈ رسل جیسے نامور فلاسفہ شامل تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا سورج طلوع ہوا اور ایک صدی سے بھی کم عرصے میں پوری دنیا پہ چھا گیا کہ اسلام کا پیغام اپنے اندر حقانیت اور علم کے بے بہا سمندر لیے ہوئے تھا۔ مسلمانوں نے اپنی کتاب تمام لوگوں تک پہنچائی جس کو دنیا کی غالب اکثریت نے قبول کر لیا۔ مسلمانوں کی عسکری طاقت اس قدر مہیب تھی کہ کئی صدیوں تک کوئی اور قوم اُن کے مقابلے میں نہ آ سکی اور اسلام ساتویں صدی عیسوی سے تیرویں صدی عیسوی تک دنیا کی غالب تہذیب کے طور پہ جانا گیا۔

تب اہل مغرب مسلمانوں کے باج گزار تھے۔ وہ قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ کی علمی روایت کے غلبے میں تھے۔ اس دور میں مسلمانوں نے علم کی بہت خدمت کی اور جہانِ دگر کی نشان دہی کی۔ اُس دور کی مثال انسانی تاریخ سے پیش کرنا مشکل ہے۔ علماء فضلا، اہل فلسفہ اور سائنس دانوں کا ایک ہجوم تھا جو مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے علم کے نئے نئے در وا کر رہا تھا۔ چنانچہ ابو موسیٰ جابر بن حیان، ابو عبداللہ محمد ابن موسیٰ الخوازمی، ابو بکر محمد ابن زکریا الرازی، ابوالحسن علی بن حسین المسعو دی، ابولوفا محمد

بن یحییٰ البز جانی، ابوریحان محمد بن احمد البیرونی، ابوفتح عمرابن ابراہیم المعروف عمر خیام، ابومروان بن زہر، ابوالولید محمد ابن احمد ابن رشد، ابومحمد عبداللہ ابن احمد البیطار، محمد ابن مسعود قطب الدین شیرازی، ابولندا اسماعیل بن علی عمادالدین الایوبی، عبدالرحمان ابن خلدون اور عمر بن عثمان جاحظ جیسے صاحب علم ودانش لوگ دنیا کی راہنمائی کا فریضہ ادا کررہے تھے۔ اِن لوگوں نے قرآن حکیم کی روشنی میں جہاں لوگوں کے بہت سے دوسرے سوالوں کے جواب دیئے وہیں انھوں نے قرآن حکیم سے کائنات اور حیات کی جو تشریح پیش کی وہ نہ صرف سادہ اور سہل تھی بلکہ عقلی طور بھی متاثر کن تھی اس لیے دنیا کی غالب اکثریت نے اسے اختیار کرنے میں کوئی تعامل نہیں کیا۔ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات پیدا کی ہے اور انسان کو اس کائنات میں اپنا نائب بنا کے اتارا ہے تا کہ وہ اس کی اطاعت کرے اس کے بتائے ہوئے احکامات کی پیروی کرے۔ جس کے نتیجے میں اسے موت کے بعد ابدی جنت کا وارث بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ اسلام آنے کے بعد خطہ ارض پہ مقیم انسانوں کے مابین جو سب سے بڑا اختلاف سامنے آیا وہ علم کی تشریح کے ضمن میں تھا۔

ایک گروہ کے مطابق عقل تمام انسانی معاملات کو محیط ہے یہ اہل مغرب اور مادیت پسند معاشروں کا تخیل ہے۔ دوسری طرف مسلمان ہیں جو کہتے ہیں اگر عقل تمام انسانی معاملات کو محیط ہے تب علم وحی کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ عقل کی ایک انتہا کے قائل ہیں اور علم وحی کو دوسرے تمام علوم پہ ترجیح دیتے ہیں۔ اس امر میں تو کوئی شک نہیں کہ علم جاننے کو کہتے ہیں معلوم سے نامعلوم عناصر تک کے سفر ہی کو علم کا نام دیا جاتا ہے۔ مگر یہ سوال ہنوز حل طلب ہے کہ اس جاننے کی آخری حد کیا ہے۔ اولین انسانی معاشروں نے جب آگ جلانا سیکھ لیا اور نوک دار لکڑی سے شکار کرنا سیکھ لیا تو انھوں نے جانا کہ وہ جاننے کی آخری حد تک آ پہنچے ہیں انھیں اپنے تمام مسائل کا حل شکار ہی میں نظر آیا کہ اُن کا بنیادہ مسئلہ خوارک تھی۔ پھر جاننے کی اس حد میں توسیع ہوئی اور انھوں نے مل جل کے رہنا سیکھا جس سے انسانی تمدن کی اولین بنیادیں وضع ہوئیں۔ ذاتی ملکیت کا تصور تو بہت بعد کی بات ہے۔ اولیٰ اول تو انسان کو صرف اپنے بقا کی فکر تھی۔ مگر جب ذاتی ملکیت کا سماج استوار ہوا تو انسانی

جذبات میں مفاد پرستی کے داعیہ نے جڑ پکڑ لی۔اہل فلسفہ نے اس ضمن میں جو مطالعہ پیش کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی جذبات میں مفاد پرستی کا جذبہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ انسانی اعمال کا سب سے بڑا محرک ہے۔کارخانہ قدرت کی کارفرمائی پہ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے ہر ذی حیات میں اس کے بقا کے لیے جہد للبقاء کی صلاحیت رکھی ہے۔مضرت سے بچنے اور منفعت کو حاصل کرنے کی یہ صلاحیت خوف و امید کے جذبات پہ استوار کی گئی ہے۔یعنی ہر پیش آمدہ مضرت کا خوف اور ہر پیش نظر منفعت کے حصول کی امید، چنانچہ یہ دو جذبات ہی ہر اختیاری حرکت، ہر انسانی فعل اور ہر عمل کے محرک ہوا کرتے ہیں۔ کہا گیا کہ انسان کی تمام جدوجہد کے سوتے خوف و امید کے چشموں ہی سے پھوٹتے ہیں اور یہی دونوں جذبات حیات کے محافظ بھی ہیں اور راہبر بھی۔

خوف و امید کی یہ دوشاخہ قوتِ متحرکہ ہی تمام کشمکش حیات کی ذمہ دار ہے اور مفاد پرستی کے تمام مظاہر اسی سرزمین سے جنم لیتے ہیں۔ چنانچہ علم و عقل بذاتِ خود قوت متحرکہ نہیں ہے بلکہ اصلاً قوت متحرکہ کا منبع خوف و امید کے وہ جذبات ہی ہیں۔عقل کا کام علم کی روشنی مہیا کرنا ہے اور اس روشنی میں انسان اپنے خوف و رجاء کے مراجع متعین کرتا اور نبرد آزمائی کے مناسب سامان مشخص کرتا ہے۔نبرد آزمائی کا عمل خوف و رجا کی قوتیں بیدار ہو کر خود سرانجام دیتی ہیں۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ عاملہ قوت خوف و امید ہی کا جذبہ ہے نہ کہ علم و عقل اس کے محرک ہیں۔خوف و امید کے مراکز متعین کرنے میں حضرت انسان نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔اُس نے جنگلی درندوں کی مضرت سے بچنے کے لیے اُن کی پرستش کی ہے۔کبھی وہ ناگ پوجا میں مصروف دیکھا گیا تو کبھی وہ ہاتھیوں کے آگے سر جھکائے دیکھا گیا۔کبھی اُس نے سورج کو سجدہ کیا تو کبھی چاند کی پوجا کی ،کبھی اُس نے گرجتے بادلوں کو اپنے بیم و رجاء کا مرجع جانا تو کبھی چمکتی بجلیوں سے امید وابستہ کی۔

چنانچہ خوف و امید کے فطری جذبات ،مضرت سے بچنے کی جبلی تمنا اور منفعت کے حصول کی خوشنما آرزو حضرت انسان کو مختلف دہلیزوں پہ سر جھکانے پہ مجبور کرتی رہی۔ پھر زمانہ بدل گیا لوگوں کے معبود بدل گئے ،طورِ زیست بدل گئے ،تہذیب و تمدن بام عروج تک جا پہنچے زندگی کی تیز رفتاری اور

مادیت کی دوڑ نے حضرت انسان کے ذہن سے خوف وامید کے وہ سارے بت توڑ ڈالے جو اُس کے خدشات کو مہمیز عطا کرتے تھے۔اُس نے خدا کے قدیمی تصور کو بھی پس پشت ڈال دیا کہ اشترا کی دنیا کو تو سرے سے کسی خدا کی ضرورت ہی نہ تھی اور سرمایہ داری نظام حیات میں خدا کے لیے وقت ہی نہیں بچتا اس کے باوجود انسان خوف ورجا کے اُس بنیادی داعیہ کو شکست نہیں دے سکا ورنہ روس امریکہ اور چین کبھی کے جدید اسلحہ کی اس دوڑ کو خیر باد کہہ چکے ہوتے جس میں وہ آج بھی مبتلا ہیں۔ تمدن کے اولین ادوار کی نوائے عصر اور تھی اور آج ہزاروں سال گذرنے پر بھی ہر قوم ہر امت کے لیے ایک نوائے عصر ہے جسے سننا اور سمجھنا ہی دانش کی علامت ہے۔آج کے انسانی سماجوں میں انسانیت کا استحصال ہو رہا ہے،عدم مساوات کا چلن ہے۔کمزور اقوام کو اُن کے بنیادی حقوق تک سے محروم کر دیا گیا ہے۔انگلستان،ناروے اور امریکہ میں کسی عام کتے کی خوارک وعلاج پہ اس قدر رقم خرچ کر دی جاتی ہے کہ تیسری دنیا کے کسی ملک کی کئی بستیاں اس رقم سے آسودہ ہو سکتی ہیں۔ نائجیر یا افغانستان اور مالی کے لوگ کسی کھانے والی چیز کے ایک ایک نوالے کو ترستے رہتے ہیں جب صرف امریکہ ہزاروں ٹن ضرورت سے زائد گندم سمندر میں پھینک دیتا ہے کہ اُس کو اِس کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ آج کی نوائے عصر ہمہ جہت ہے جس کے لیے ہمیں آج کے انسانی سماجوں کے پس منظر میں جھانکنا ہوگا۔آج انسانیت اُس سامراج کے جبڑوں میں محصور ہے جس کو بہت سے مہذب نام عطا کر دیئے گئے ہیں۔ہم اُن کو IMF،word bank کے ناموں سے جانتے ہیں اور دوسرے بے شمار مالیاتی ادارے ہیں جن کی بنیادوں میں انسانی خون اور آنسو ہیں جن کے نظریہ میں مادی مفاد اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔مادیت کی اس انتہا کی ابتدا تو اسی روز ہوگئی تھی جب انسان نے ذاتی ملکیت کی بنا پہ اپنے دوسرے بھائی کا خون بہایا۔اس کے بعد ابن آدم کے اندر ہر اُس شئے کی ملکیت کی خواہش سر اٹھانے لگی جو اسے مفید لگی۔تب اُس کے جذبات نے اُس کی راہنمائی کی اور انسان ملکیت کے شدید احساس سے مغلوب ہو گیا۔اب ذاتی مفاد کے حصول

کے لیے طاقت کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگئی۔ بود و باش کے طریقے جوں جوں اجتماعی شکل اختیار کرتے چلے گئے مفاد پرستی کے بھی نئے نئے پہلو سامنے آنے لگے خاندان قبیلہ گاؤں اور قوم کے جتھوں کی عصبیت پروان چڑھنے لگی۔ حقوق کا تصفیہ طاقت کی بنا پہ ہونے لگا۔ مگر پھر جب خون ایک حد سے زیادہ بہنے لگا تو لوگ مل بیٹھے حق کوشی اور انصاف پرستی کی ضرورت کا احساس شدت اختیار کر گیا۔

حق وانصاف کا فلسفہ فروغ پانے لگا۔ صاحب فہم اور سلیم الطبع لوگوں نے نظری طور پہ اس اصول کو تسلیم کرلیا کہ بنی نوع انسان کی ہمہ گیر فلاح کے لیے ضروری ہے کہ حق وانصاف کے تقاضوں کو مفاد پرستی اور خود غرضی کے تقاضوں پہ ترجیح دی جائے۔ یہ تمدن کے اولین دھندلکے تھے جب انسانی شعور بھی اپنی پختگی تک نہ پہنچا تھا۔ تب انسان نے بنیادی انسانی حقوق اور اخلاق کے جس تصور کو پیش کیا آج کا انسان تو اُس سے بھی پست اخلاقی سطح پہ کھڑا ہے اس لیے کہ آج کے تیز ترین میڈیا میں بجلی کی طرح چمکتی کیمروں کی آنکھوں کے سامنے جس ڈھٹائی سے جھوٹ اور منافقت کا مکروع کھیل کھیلا جاتا ہے اُسے دیکھ کے تو پتھر کے زمانے کا انسان بھی شرما جائے۔ متمدن اقوام کے طرز عمل کا مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِن اقوام کے با اقتدار اصحاب، علوم وفنون کے ماہر، خارجہ امور کے چوٹی کے ماہرین، فطرت انسانی کے نبض شناس، زمانہ کے سرد گرم سے آشنا، اخلاق کے دھنی، مہذب ہونے کے دعویدار، اعلیٰ لباسوں میں ملبوس، عمدہ اور پر شکوہ عمارات کے وسیع وعریض حال میں عالمی میڈیا کے کیمروں کی چنگھاڑتی فلیش لائٹوں میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے کہ انھوں نے انٹیلی جنس کی غلط رپوٹوں کی بنا پہ عراق پہ حملہ کیا تھا۔ عراق میں دس لاکھ انسانوں کو قتل کیا گیا جن میں چار لاکھ دس سال سے کم عمر کے بچے شامل ہیں۔

چنانچہ طاقت اور معیشت کا ایک مہیب عدم توازن ہے جس سے آج کی دنیا نبرد آزما ہے۔ دولت کا بہاؤ مغرب کی طرف ہے کہ انھوں نے جدید علوم معاشیات اور طاقت کے ذریعے زمانے کی لگام تھام رکھی ہے۔ اہل مغرب نے ذاتی مفاد کے وہ پہلو وضع کیے جس سے باقی ساری دنیا مغلوب ہو

کے رہ گئی۔ انھوں (G8) کے نام سے معاشی غلبہ کی ترکیب کی تو (NATO) کے ذریعے عسکری طور پہ اقوام عالم کو مرعوب کیا۔ چنانچہ آج کی دنیا جس انارکی اور افتراق کا شکار ہے اُس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ آج اقوام عالم خاص طور پہ خود کو مہذب کہنے والی اقوام نے زمین کا چہرہ انسانی خون سے رنگ دیا ہے۔ انسان نے دوسری جنگ عظیم سے کوئی سبق نہیں سیکھا جس میں دو کروڑ سے زائد لوگ مارے گئے تھے اور یہ ابھی کل کی بات ہے۔ مہذب اقوام کے مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں۔ چین کی معیشت امریکہ کے لیے دردسر بنی ہوئی ہے تو امریکہ کی جارحانہ پالیسیاں مسلمان ملکوں کا سانس روکے ہوئی ہیں۔ عالمی ادارے عدل سے عاری اور استحصال کی روش پہ گامزن ہیں۔

چنانچہ کارگاہِ حیات میں اس قدر شور ہے کہ کوئی بات واضح طور پہ سنائی نہیں دیتی۔ انسان بہ حیثیت مجموعی خالق سے منہ موڑے بیٹھا ہے اُس نے اپنی زندگی کو کچھ اس طرح متعین کیا ہے جس میں وہ ہر لمحہ زیست کو شادمان بنانا چاہتا ہے۔ مگر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اطمینان آسودگی اور سکون کی منزل سے دور ہے کہ اُس نے اپنی مادی زندگی کو مزین کرنے کے لیے تو بہت کچھ سامان فراہم کیا مگر اپنی روحانی زندگی کو اس قدر تشنہ بنا دیا کہ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس انفرادی رویے کا عکس اقوام کی اجتماعی ہیت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو ردعمل اور جارحیت کی طرف مائل ہیں۔ خطہ ارض پہ دو بڑے انسانی گروہوں یعنی مسلمان اور غیر مسلم خاص طور پہ اہل مغرب کو اپنے رویوں میں جن مثبت امور کی طرف متوجہ ہونا چاہیے وہی اُن کے لیے نوائے عصر ہے۔ مغرب کو اپنی سماجی عقائدی، معاشی بنیادوں پہ نظر ثانی کرنی چاہیے کہ انھوں نے مادیت کی انتہا پہ بھی جا کے دیکھ لیا ہے کہ سکون اور اطمینان کی دولت اُن سے دور ہی رہی۔

دوسری طرف مسلمان ہے جو سیادت کی بازیافت میں محو ہے مگر جدید علمی روایت سے نابلد ہونے کی وجہ سے راستہ کھوجنے میں کامیاب نہیں ہو رہا۔ اُن کی دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب یعنی قرآن کو بھی پس پشت ڈال رکھا ہے۔ وہ تفرقے میں پڑ چکا ہے اور ایک بے جا مذہبی جنون میں مبتلا ہے جس کی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان کئی صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی کی

دولت سے سرفراز ہوا ہے ابھی اُس کی بنیادیں مستحکم نہیں۔ابھی اُس نے کئی مشکل مراحل سے گزرنا ہے۔ابھی اُس نے اپنی سحر گم گشتہ کو تلاش کرنا ہے۔ابھی اُس نے اپنے علم کی اُس کھوئی ہوئی میراث کو تلاش کرنا ہے جس کی بنا پہ اُس نے ہزار سال تک دنیا کی راہنمائی کی۔ابھی اُس نے خود کو پھر سے قرآن کی تعلیمات پہ استوار کرنا ہے کہ قرآن ہی اُس کا فخر ہے اور قرآن ہی کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔قرآن صرف مسلمانوں کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ قرآن تو انسان کو مخاطب کرتا ہے قرآن ہی دنیا میں علم کا وہ واحد منبع ہے جو خالص ہدایت سے مزین ہے۔مگر انسان نے علم کی جو تشریحات کی ہیں وہی اُس کے رویے میں کجی کا باعث ہیں،علم کی تشریح میں اُسے کہاں کہاں ٹھوکر لگی ہے اُس کا مفصل جائزہ لینا ہی یہاں مقصود ہے۔

✡ ✡ ✡

علم کی ماہیت

سکول و کالج میں نصاب پڑھتے ہوئے اساتذہ ہمیں بتاتے رہے کہ علم سے مراد ہے جاننا۔یعنی نامعلوم سے معلوم کے بیچ کا فاصلہ علم کہلائے گا۔اگر چہ علم کی یہ تعریف کوئی غلط تعریف نہیں ہے تاہم علم کی حقیقی ماہیت اس سے کافی بعید ہے۔علم دراصل اس شعور کا نام ہے جو انسان نے طویل تہذیبی منزلوں کے بیچ حاصل کیا۔علم کی داستان کئی ہزار سالوں پہ محیط ہے۔اول اول انسان کی ضروریات محدود تھیں اس لیے اُس کا علم سطحی تھا تاہم جب تمدن کی بنا پڑی اور انسان خود کو مہذب کہنے لگا۔تب اُس کے علم میں وسعت آتی چلی گئی۔صاحبِ دانش فضلا نے بیان کیا کہ جاننا انسان کی جبلی خواہش ہے۔یعنی علم کی طرف مراجعت قدرت کی منشا ہے۔قدرت نے انسان کو کئی جبلی خصائص سے نوازا ہے جن سے وہ اپنی حیات کی ڈور قائم رکھتا ہے۔جن سے وہ مضرت اور منفعت کا شعور حاصل کرتا ہے۔اور انھی جبلتوں کی بدولت انسان اپنے اندرون کا حال کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر طور پہ جانتا ہے۔چنانچہ اگر اُسے بھوک لگی ہے تو بھوک کا یہ احساس اُس کا ذاتی احساس ہے جس میں کوئی

دوسرا اس کا شریک نہیں ہوسکتا۔جس کو بھوک لگی ہو وہی جان سکتا ہے کہ وہ بھوکا ہے، اُسے کھانا چاہیے۔اسی طرح انسان کی دوسری جبلتوں کا معاملہ ہے۔شعوری ابتداء ہی سے وہ جان لیتا ہے کہ آگ کے نزدیک نہیں جانا کہ یہ جلا دیتی ہے۔سانپ سے دور رہنا ہے کہ وہ ڈس لیتا ہے۔چنانچہ علم کی یہ وہ قسم ہے جو قدرت کی طرف سے انسان کو عطیہ کے طور عطا کی گئی ہے۔دراصل یہ اسی احسان کا تسلسل ہے جو خالق کی طرف سے ہمیشہ انسان کا احاطہ کئے رہتا ہے۔علم کی دوسری قسم وہ ہے جو انسان اپنے خارج سے حاصل کرتا ہے۔اُس کی سب سے پہلی درسگاہ اُس کی ماں کی گود ہے۔اُس کی دوسری درسگاہ اُس کی گلی، اُس کا محلّہ ہے اُس کے ساتھی اور دوست ہیں۔اُس کا سکول اور اُس کے اساتذہ ہیں۔جن سے وہ زیست کے اطوار سیکھتا ہے اور معاشرتی طور پر خود کو ایک اہل اور ذمہ دار شہری بنانے کی کوشش کرتا ہے۔یہ علم کا وہ تسلسل ہے جو ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔اپنے شعوری ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کی سوچ اور نظریات میں تبدیلی آتی رہی ہے۔چنانچہ اس سفر زیست میں جس نے جتنا جانا وہی اُس کا علم کہلائے گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اُسی کلاس میں جس میں ہمارا بچہ پڑھ رہا ہے۔دو تین ایسے بچے بھی ہوں گے جو غیر معمولی طور پہ ذہین ہوں گے۔اساتذہ کو اُن کے ساتھ زیادہ مغز کھپائی نہیں کرنی پڑتی۔ایک دفعہ بات سمجھانے سے بات اُن کی سمجھ میں آجاتی ہے۔اس سے ہم اصول ذہانت کا استخراج کرتے ہیں کہ اگرچہ اُن بچوں اور دیگر بچوں کی نہ تو عمر میں زیادہ تفاوت ہے اور نہ ہی اُن کی شعوری سطح مختلف ہے۔فرق صرف ذہانت کا ہے۔جس کی وجہ سے وہ بچے ممتاز نظر آتے ہیں جو اپنے دوسرے ہم عمروں سے زیادہ ذہین ہیں۔اب چونکہ علم کا ذہانت سے براہ راست تعلق ہے۔اس لیے جب اسی کلاس کے تمام بچے شعوری پختگی تک پہنچیں گے تو وہ دو تین بچے جو کلاس میں پہلے روز سے نمایاں تھے اُن کے علم کی سطح اپنے ساتھیوں سے بہت بلند ہو چکی ہو گی۔چنانچہ یہ شعور کہ ایک ذہین آدمی اشیا کی ماہیت کو کس طرح پہچانتا ہے یا اسی بات کو یوں کہہ لیں کہ آئین سٹائن اور نیوٹن جب طالب علم ہوں گے تبھی سے یہ بات دکھائی دے رہی ہو گی کہ اِن ہونہار بچوں کی دلچسپی کے امور دوسرے بچوں

سے قدرے الگ ہیں اور وہ اشیا کی ماہیت کو دوسروں سے زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھتے ہیں اور اپنے ہی ہم سن دوستوں سے مشاہدے میں بہتر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ چنانچہ صاحب علم لوگوں نے اس بات کا تذکرہ کیا کہ اول اول انسانی تمدن کو اشیا کی ماہیت جاننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ سادہ اور سہل زندگی کرتے تھے جس میں انھیں مشاہدے اور تدبر کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی تھی۔ مگر جب انسانی سماج نے تمدن کے کئی پڑاؤ عبور کر لیے اور اُسے ابلاغ کا سلیقہ بھی آ گیا تو یہ سوال انسان کی مشکلات میں اضافہ کرنے لگا کہ وہ اشیا کی ماہیت کو کیسے جانچے۔

چنانچہ معلوم انسانی تاریخ اس ضمن میں ہماری جو راہنمائی کرتی ہے اُس کے مطابق اولین دور سے ہی انسان نے اشیا کی ماہیت پہ غور کرنا شروع کر دیا تھا اور قبل از تاریخ سے ہی اس میدان میں انسان کی جہد وسعی کے نشان ملتے ہیں۔ مدون تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے پہلے یونانی صاحب دانش اس سوال کو حل کرنے کی کوشش میں تھے اور انھوں نے اس ضمن میں کئی نظریات بھی پیش کیے۔ اگر چہ وہ نظریات نہ تو کلی طور پہ قابل قبول تھے اور نہ ہی اس ضمن میں انھیں مسئلے کو حل قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کوشش سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ آنے والی نسلوں تک یہ سوال منتقل ہو گیا کہ انھوں نے اشیا کی ماہیت کو جاننا ہے۔ کائنات کے اسرار کھولنے ہیں، سمندروں کی تہوں میں جھانکنا ہے، آتش فشاؤں سے نبرد آزما ہونا ہے۔

چنانچہ اس جہد وسعی کے نتیجے میں اس دور کی انسانی فکر نے ارتقاء کی کئی منزلیں طے کر لیں اور علم کی طرف تیزی سے گامزن رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُسی دور میں انسان نے مذہب، اخلاقیات، سیاسیات فلسفہ، سماجیات اور دیگر کئی فنون میں حیرت انگیز مراحل طے کیے اور انسان کی راہنمائی اُن منزلوں کی طرف کی جو بنی نوع انسان کی منتظر تھیں۔ علما نے کہا کہ اس ساری گہما گہمی سے علم کی ایک نئی دنیا وجود میں آئی اور یونان کے صاحبِ دانش فضلا نے سیاسی، معاشی اور علمی تجربات کے ایک نئے عہد کا آغاز کیا جسے ہم بلاشبہ انسانی تاریخ کا روشن باب قرار دے سکتے ہیں۔ انسان کے سامنے کی چیز حیات ہے۔ اس لیے علم کے ابتدائی خدوخال حیات کی بقا کے علم سے ہی وابستہ ہیں۔ انسان چونکہ

محض ایک مادی وجود ہے اور جب تک اللہ کے پیغمبر انسان کو یہ بات نہیں بتاتے کہ اُن کی روحانی حیات میں رونق اُن کے کن اعمال سے آئے گی اُس وقت تک انسان نے محض مادی محور میں ہی علم کی تگ ودو کی۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آج بھی تو مادیت ہی کے علوم چار سو غالب نظر آتے ہیں اور روحانی علوم کو انسانی معاشروں میں چنداں اہمیت حاصل نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ صریحاً انحراف ہے اور یہ ایک الگ موضوع ہے جس پہ انشاء اللہ الگ سے بحث ہوگی۔ یہاں ہم انسان کے اُس شعوری ارتقاء سے بحث کر رہے ہیں جسے طے کرتے ہوئے وہ آج کی اس ہمہ رنگ دنیا تک پہنچا ہے جس میں ہر طرف علم کے انگنت جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ جب انسان نے مادی علم کی ابتدا کی اور حیات کی بقا کی جدوجہد میں نت نئے راستے تلاش کرنے شروع کیے تو اُس کے سامنے علم کی کوئی واضح منزل نہ تھی بلکہ یہ تگ ودو اور جہدِ مسلسل کا ایک عہد تھا جس میں انسان نے اپنی طبی حیات کی طرف توجہ مرکوز رکھی۔

چنانچہ جب انسان نے اپنے مادی وجود کی بقا کے بارے میں یقین کی ایک منزل کو حاصل کر لیا تو اُس کے سامنے دوسری منزل یہ تھی کہ اس حیات کو درپیش مسائل سے کیسے نمٹا جائے۔ چنانچہ اس سوچ سے علم کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے جس میں انسان نے اپنی طبیعی عمر میں آسانی اور آسائش کے حصول کی طرف توجہ مرکوز کی۔ اس نقطہ نظر کے تحت انسان کے تدبر و تفکر کی بنیاد یہ قرار پائی کہ وہ قدرتی آفات اور بیماریوں سے کس طرح نجات پا سکتا ہے۔ انسان کی چشم حیراں نے اُس منظر کا مشاہدہ بھی کیا کہ جب وبائیں آبادیوں کی آبادیاں کھا جاتیں، تب اُس نے علم طب کی طرف رجوع کیا اور غور وفکر سے کسی نتیجے تک پہنچنے کے سفر کا آغاز کیا۔

انسان نے دیکھا کہ بھوک اُس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، چنانچہ اُس نے خوراک حاصل کرنے اور اسے اُگانے کی طرف خصوصی توجہ کی اور جلد ہی وہ اس قابل ہو گیا کہ اب لوگ بھوک کی وجہ سے نہ مرتے تھے۔ وہ مسلسل غور کرتا رہا کہ وہ دکھ اور مصائب جو اُسے زندگی کی راہ میں درپیش ہیں اُن کے تدارک کا طریقہ کار کیا ہو۔ کس طرح سے انسانی زندگی کو زلزلوں سے، سیلابوں سے، آتش فشاؤں

سے،اور وباؤں سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔یہی وہ ابتدائی سوچ تھی جس پہ آج کے جدید علم طب، علم سائنس، علم معاشیات، علم عمرانیات، علم ساجیات اور علم سیاسیات کی بنا رکھی ہے۔انسان نے جہد و سعی کا ایک طویل دور گزارا ہے۔جس کے بعد اُس نے اپنی زندگی کے اُن مسائل کا مطالعہ کیا اور اُن مسائل و مصائب کا حل تلاش کیا۔یوں علم کے ان گنت شعبہ ہائے جات وجود میں آتے چلے گئے اور انسان نے اُن حیرت انگیز کمالات کی طرف اپنا سفر شروع کیا جس سے ہمارے دن رات میں آسائش اور آسودگی ہے۔مگر اس ساری داستان تگ و دو میں ایک بات کھل کے سامنے آ جاتی ہے کہ انسان نے علم کی دنیا میں جو بھی نیا شعبہ دریافت کیا اُس کے پس منظر میں اُس کی مادی زندگی کی بقاء اور آسانی ہی کی خواہش کارفرما تھی۔ہر نئی ایجاد اور ہر پیش رفت کے پیچھے مادی زندگی کو باقی رکھنے اور اسے محفوظ بنانے کا تصور ہی کارفرما رہا ہے۔اور انسان کی یہی سوچ برقرار رہی حتی کہ صدیوں پہ صدیاں گرزنے لگیں۔اگر چہ بیچ میں انسان کو کچھ ایسے لوگوں کا سامنا بھی کرنا پڑا جنھوں نے اُن سے کہا تم غلط سمت کی طرف جا رہے ہو۔تب انسان نے نگاہ حیرت سے اِن لوگوں کی بات کو سنا مگر در کر دیا کہ انھیں مادیت کی جن منزلوں کی تلاش تھی وہ اِن کے بہت قریب آ پہنچے تھے۔

مادیت کی منزل کی طرف بنارُ کے بھاگنے والے اِن انسانی گروہوں کو جن لوگوں نے ٹوکا وہ اللہ کے پیغمبر تھے جن کے پاس دانش کی بات تھی جن کے پاس علم کا وہ ذریعہ تھا جس سے انسان نا آشنا ہے جنھوں نے انھیں مادیت سے روحانیت کی راہ پہ آ جانے کی تلقین کی۔مگر لوگ کم ہی شکر کی راہوں کو منتخب کرتے ہیں۔چنانچہ اس نئے دور میں جب سن عیسوی کا آغاز ہو چکا تھا انسان نے علم و عمل کی بہت سی منزلیں طے کیں۔اگر چہ اُن میں روحانیت کی کوئی منزل نہ تھی بلکہ صرف مادیت کے مظاہر تھے جن کی طرف انسان نگاہ حسرت سے دیکھتا تھا اور اُن اہداف کو حاصل کرنے کے جنون کا شکار تھا جس کو اُس نے خود ہی متعین کر لیا تھا۔مادیت کی اِن منزلوں کی طرف انسان کا سفر جاری رہا۔وہ بہت سے میدانوں میں سرخرو ہوا اور خود کو علم کا راہی جانتا رہا کہ اُس نے جو بھی منزل حاصل کی اُس کے پیچھے اُس کی شدید محنت، گہرا مشاہدہ اور من پسند نتیجے کے حصول کی خواہش تھی۔انسان کے

اہداف میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا۔ یوں علم منقسم ہونے لگا۔ کوئی طب کی مہارت اختیار کرنے لگا تو اُس کا ساتھی بڑی بڑی عمارتوں کو بنانے کا شائق نکلا۔ پہلے پہل یہ تمام شعبہ جات متصل تھے اور ایک ہی آدمی عمارت بھی بناتا تھا اور علم طب میں بھی کسی قدر ادراک رکھتا تھا مگر اس طرح بات نہ بنی اور لوگوں نے مہارت کی آخری حد تک جانے کا سوچا۔ یوں علم کے وہ بہت سے شعبہ جات سامنے آئے جن سے آج ہماری آنکھیں مانوس ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ انجنیئر عمارت بناتا ہے، ڈاکٹر بیماری کا علاج کرتا ہے، پائلٹ جہاز آڑاتا ہے، سیاست دان حکومت کرتا ہے اور سائنس دان نت نئ ایجادات سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ جدید دنیا تک پہنچتے پہنچتے علم کے اس قدر حصے بخرے ہوئے کہ آج علم کے اس قدر شعبہ جات ہیں جن کی گنتی تک ممکن نہیں۔ لوگوں کی سوچ اس نہج تک آ پہنچی کہ انھوں نے سوچا کہ مادیت کی اس جہد وسعی کی انتہا آ گئی ہے اور اس کے بعد کوئی ترقی نہیں بلکہ محض جمود ہے۔

انسان نے فکری ترقی اور ارتقا کی تمام منزلیں طے کر لی ہیں اب تمام دنیا ایک جمہوری اور سرمایہ دارانہ نظام کی طرف بڑھ رہی ہے جس میں اُن کی سوچ کے مطابق انسان کی فلاح کی دیگر منزلیں ہیں۔ چنانچہ اس نظریہ علم میں انسانی فکر اور اعمال کی کامیابی کی آخری منزل بھی مادی آسودگی ہی ہے اور کامیابی کا معیار انسان کا سماجی اور معاشی معیار ہی ٹھہرا۔ یہ ایک بڑے انسانی گروہ کی علمی کاوش ہے جس کے نتیجے میں مادی نظریہ حیات پرورش پاتا رہا۔ یہ بحث اس علمی نظریہ ہی سے پیوست ہے کہ اس نظریہ علم نے انسانیت کو کیا دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جدید سائنس نے انسان کی زندگی کو بہت سہل بنا دیا ہے اور انسان اب منٹوں میں وہ فاصلہ طے کر لیتا ہے جو پہلے دِنوں میں بھی طے نہیں کر سکتا تھا۔ انسان نے غذا کی قلت کو دور کر دیا اور اپنے زرائع پیداوار میں بے پناہ ترقی کی ہے اور اب لوگ بھوک سے نہیں مرتے۔ انسان وبائی امراض پہ بڑی حد تک قابو پا چکا ہے اور اب وبائیں لوگوں کی بستیاں نہیں اجاڑتیں۔ انسان ایک لمحے میں ہزاروں میل دور بیٹھے اپنے دوست سے اس طرح بات کر رہا ہوتا ہے جیسے کہ وہ اس کے سامنے بیٹھا ہو۔ انسان آواز کی رفتار سے تیز سفر کر رہا ہے، اُس نے

ہواؤں میں اڑنا سیکھ لیا ہے، اُس نے سمندر کی پہنائیوں میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں، انسان چاند پہ چہل قدمی کر چکا ہے اور اُس کے مشن مریخ کی سرزمین پہ اترنے لگے ہیں۔ سیاسی، سماجی اور معاشی میدانوں میں بھی بنی نوع انسان کی ترقی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پہ بیسویں صدی میں انسان کی مختلف علمی میدانوں میں ترقی کی رفتار اس قدر تیز رہی ہے کہ گذشتہ صدیوں سے اس کا موازنہ کرنا لا حاصل ہے۔ مگر وہ سوال جو اس بحث کا نقطہ آغاز تھا کہ کیا مادی میدان میں اس قدر رفعتیں حاصل کرنے کے باوجود اس ماہیت علم نے انسان کو دکھ سے آزاد کر دیا ہے، انسان کو غربت سے نجات دلا دی ہے، انسانیت کو عدل و انصاف فراہم کر دیا ہے یا مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ کیا آج کا انسان خوش ہے، مطمئن ہے۔ تو اس کا جواب نفی میں آئے گا کیونکہ اگر چہ مادیت کے اِن علمی مظاہر کی چمک دمک بظاہر اسی بات کا عندیہ دیتی ہے کہ لوگ خوش ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ لوگ نا خوش ہیں۔ اس لیے کہ خوشی کا دولت سے کوئی تعلق نہیں۔ خوشی تو اُس احساس اور آسودگی کا نام ہے جس میں انسان کی روح آسودہ ہو اور وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرے۔ مغرب نے خوشی و اطمینان کو مادیت کی انتہاؤں میں کھوجا مگر اُسے ناکامی کا سامنا ہے۔ یہ تو اُن اقوام کا حال ہے جن کو مادی رفعت بہر طور حاصل ہے اگر چہ تیسری دنیا کے اکثر ممالک دکھوں کے مہیب سائے میں زیست کر رہے ہیں۔

آج خطہ ارض پہ انسانوں کی اکثریت غربت میں زندگی بسر کر رہی۔ معدودے چند ممالک ہیں جنھوں نے اپنے شاطر ذہنوں کی بنا پہ استحصال کا وہ نظام وضع کیا ہے جس کی بنا پہ وہ معاشی طور پہ آسودہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ورنہ دنیا بھر کی آبادیاں زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے سسک رہی ہیں۔ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک تعلیم صحت اور عدل و انصاف جیسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ مادیت کا وہ نظام جس پہ مغرب اترا رہا ہے انسان کے بنیادی مسائل کا حل پیش نہیں کرتا۔ چنانچہ انسان کو علم کی دیگر جہتوں کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا اُسے نئے جہانوں کی تلاش کرنا ہوگی۔ اگر علم کی یہ ماہیت انسان کے بنیادی مسائل حل نہیں کر رہی تو

بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی یہ جہد وسعی عبث ثابت ہوئی ہے اور انسان کو اپنے نظریہ حیات پہ نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی عقل اس قابل ہے کہ وہ محض عقل وشعور کی بنا پہ اُس تصوراتی معاشرے کی تشکیل کر سکے جس کا خواب علم مادیت کی بنیادیں فراہم کرنے والوں نے فراہم کیا تھا۔ کچھ اسی طرح کے خواب اشتراکیت کے بانیوں نے بھی اپنی عوام کو دکھائے تھے مگر وہ نظام ایک صدی سے بھی کم عرصے تک چل سکا۔ اور لوگ جلد ہی اس کے کھوکھلے پن سے آگاہ ہو گئے۔ آج جن معاشروں کو آسودہ سمجھا جاتا ہے انھیں معاشروں میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مظاہرے کیے جا رہے ہیں انھی ممالک کے شہری (G8) کے مالیاتی منصوبوں کو غیر انسانی اور غیر منصفانہ قرار دے رہے ہیں۔ یہاں ایک لحہ رُک کے اس سوال پہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ انسان نے زندگی کے مختلف میدانوں میں علم کے جو نظام وضع کیے ہیں اُن کا ثمر میٹھا ہے یا کڑوا ہے۔ انسان اس علم کے مبادیات سے مطمئن ہے یا غیر مطمئن، انسان اِس نظام زندگی کے تحت آسانی میں ہے یا مشکل میں، کیا اس نظام زیست نے انسان کے اُس تصوراتی معاشرے کو متشکل کر دیا ہے جس میں ہر طرف خوشیاں اور ہر طرف آسودگی نظر آئے۔ اِن تمام سوالوں کا جواب یہ ہے کہ نہیں انسان غیر مطمئن ہے۔

وہ بھی جو معاشی طور پہ آسودہ ہے اور وہ بھی جو معاشی پستی کا شکار ہے۔ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر علمی میدانوں میں اتنی ترقی کے باوجود انسان منزل سے ہنوز دور ہے تو آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ اس مسئلے کا آسان اور سیدھا حل یہ ہے کہ انسان عقل کی نارسائی کو تسلیم کرے۔ اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو اور خالق کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرے تب اُس کی زندگی میں بہار کے وہ رنگ ظاہر ہوں گے جن کی تشنگی اس کے رگ وپے میں موجود ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ خدا کی ہدایت یافتہ قوم جن کو اُس نے اپنی آخری کتاب عطا فرمائی جس میں علم کی حقیقت کا بیان ہے جس میں زیست کی الجھنوں کا حل ہے، جس میں انسان کے سارے مسائل کا حل ہے۔ وہ تو خود عسرت اور پس ماندگی میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ تو اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ انھوں نے کتاب پہ

عمل ہی نہیں کیا اگر وہ عمل کرتے تو زمام کار اُن کے ہاتھ میں ہوتی وہ جنھوں نے دنیا کی راہنمائی کا فریضہ ادا کرنا تھا انھوں نے کتاب ہدایت کو ریشمی غلاف چڑھا کے بلند مقام پہ رکھ چھوڑا ہے تا کہ وہ بچوں کی پہنچ سے بھی محفوظ رہے اس طرح وہ بڑوں کی پہنچ سے بھی محفوظ ہو گئی کہ وہ بھی اسے کبھی کبھار گرد جھاڑنے کے لیے ہی اتارتے ہیں ہدایت حاصل کرنے کے لیے نہیں؟؟؟

✡ ✡ ✡

علم کے ارتقائی مراحل

انسان نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ایک خوف نے اس کا حصار کر رکھا تھا۔ وہ اپنی بقا کے خوف کا شکار تھا، وجودیت کے زائل ہو جانے سے ڈرتا تھا۔ وہ زندہ اور موجود رہنا چاہتا تھا مگر اِس کے لیے اُس کو شدید جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ زرعی انقلاب سے پہلے انسان اپنی ڈورِ حیات کو برقرار رکھنے کے لیے شکار کھیلا کرتا تھا۔ اُس سے قبل کے حالات قدرے اندھیرے میں ہیں کہ انسان کی مدون تاریخ کی عمر دس ہزار سال سے زیادہ نہیں۔ قبل از تاریخ کے انسان کی جہد و سعی کا محض قیاس کیا جا سکتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اُس نے نوکدار لکڑی سے جانور کا مقابلہ کیا اگرچہ وہ جانوروں سے زیادہ طاقت ور نہ تھا۔ تاہم اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عقل عطا کی گئی تھی اُس کی بنا پہ رفتہ رفتہ اُس نے خود سے طاقتور اور پر ہیبت جانوروں کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا۔ جس کے بعد وہ اُن پہ غالب ہو گیا اور یہ غلبہ ابدی تھا اس لیے کہ اس کے بعد جانور کبھی بھی انسان کے لیے مسئلہ نہیں بنے۔ البتہ انسان جانوروں کے لیے ضرور مسائل پیدا کرتا رہا کہ شکار کی بے پناہ عادت نے جانوروں اور پرندوں کی کئی نسلوں کو معدوم کر دیا۔ جب انسان نے آگ جلانا سیکھا تب تمدن کی بنا پڑی۔ انسانوں

نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ مل جل کر رہنے سے وہ خطرات سے زیادہ محفوظ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ غاروں میں پہاڑوں کی کھوؤں میں اور گھنے جنگلات میں گروہ کی شکل میں رہنے لگا جس سے علم سماجیات کا آغاز ہوا۔ شعوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر اس احساس نے بھی انگڑائی لی کہ وہ مخلوق ہے تو یقیناً کوئی خالق بھی ہوگا۔ چنانچہ اول اول اُس نے کسی غیر مرئی اور انتہائی طاقت ور مخلوق کی تلاش میں کی جسے وہ اپنا معبود قرار دے کر اُس کی پوجا کرے۔ اِس دور میں انسان نے ہر اُس چیز کو پوجا کی جو پر ہیبت ہو جس سے وہ ڈرتا ہو، جو جسامت میں بڑی ہو چنانچہ ہاتھی گینڈا، سانپ، پہاڑ، سورج، چاند، ستارے، سمندر اُس کے معبود رہے اور انسانی تاریخ میں علم مذاہب کی بنا رکھی گئی۔ عصر حاضر کے ایک مورخ سیّد علی عباس جلالپوری انسان کے اس دور کی تمدنی تہذیبی اور مذہبی ارتقاء پہ روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب " **کائنات اور انسان** " میں لکھا ہے کہ!

"انسان کے قدیم آباء جو لنگور، چمپانزی اور گوریلا کے چچیرے بھائی تھے ابتداء میں انھی کی طرح درختوں پہ بسیرا کرتے تھے۔ یخ (ICE AGE) کے طویل زمانوں میں جب جنگل برفانی تودوں کی لپیٹ میں آ گئے تو انسان نے پہاڑوں کی کھوہوں میں پناہ تلاش کی۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ انسان نے دو ٹانگوں کے بل چلنا سیکھ لیا جس سے اُس کے ہاتھ کام کرنے کے لیے آزاد ہو گئے۔ اور وہ لٹھ تھام کر گھومنے پھرنے لگے۔ لٹھ اُن کے بچاؤ کا ہتھیار بن گیا اور اِس سے وہ جانوروں کا شکار بھی کھیلنے لگے۔ قدیم پتھر (STONE AGE) کے زمانے میں انسان نے دو پتھروں کی باہمی رگڑ سے لکڑی کو جلانے کا طریقہ سیکھ لیا۔ ازاں بعد انھوں نے آگ کو محفوظ کرنے کا طریقہ بھی سیکھ لیا۔ آگ کے الاؤ اُن کی اندھیری راتوں کو روشن کرتے اور درندوں کو اُن کی غاروں اور کمین گاہوں سے بھی دور رکھتے۔ چنانچہ لٹھ اور آگ کے استعمال سے ایک نیا

حیوان نمودار ہوا جسے نیم انسان کہا جا سکتا ہے۔ نیم انسان نے قدرت کے جبر کو توڑ کے
رکھ دیا جس سے دوسرے حیوانات آج تک آزاد نہیں ہو سکے۔ رفتہ رفتہ اُس نے لٹھ
کے سرے سے نوکیلا پتھر باندھ کر اسے برچھا بنا لیا جب کہ دوسرے درندے بدستور
پنجوں اور دانتوں سے کام لیتے رہے۔ اس ہنر مندی کی تہہ میں وہ تبدیلیاں کار فرما
تھیں جو یخ کے زمانوں میں قدرت کے شدائد کے خلاف طویل دور کشمکش میں انسان
کے ذہن میں واقع ہوئی تھیں۔ اول تو یہ کہ اُس کے سر مغز کے حجم میں اضافہ ہو گیا تھا
ثانیاً یہ کہ اس کے دماغ کے اس حصے میں جسے (NEO CORTEX) کہتے ہیں
سوچ اور خود شعوری (SELF CONSCIOUSNESS) کی صلاحیتیں
بیدار ہو گئیں۔ اس جوہرِ ذہن کی نشو و نما نے جہاں اس کے ذہن میں عقدوں کا شعور
پیدا کیا وہاں انھیں سلجھانے کے لیے وسائل بھی فراہم کیے۔ داخلی پہلو سے دوسرے
حیوانات، درندے اور پرندے بدستور اپنی قدیمی جبلتوں کے اسیر رہے۔ اور آج بھی
جب کہ نیم انسان کے ذہنی ارتقاء نے اِن جبلتوں کے تصرف کو توڑ دیا ہے اور اپنی نئی
فکری صلاحیتوں کے طفیل اس نے فطرت کے قوانین کو سمجھنے اور انھیں اپنے حق میں
ڈھالنے کا آغاز کیا ہے تب بھی برچھے کے استعمال، آگ کی دریافت پہیے اور کشتی کی
ایجادات اور گفتگو نے اس کے اعتماد نفس میں اضافہ کیا ہے۔ اِس نے ہڈی کی سوئی اور
تسمے سے کھالیں سی کر جاڑے کی یخ سے محفوظ رہنے کا راز معلوم کر لیا اور گوشت کے
مچوں کو آگ پہ بھون کر زیادہ خستہ اور مزیدار بنا لیا۔ اُس نے ذہنی ترقی کے باعث
جہاں اپنے خارجی ماحول کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی وہیں اُس کی
داخلی دنیا میں بھی عجیب و غریب تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ نفسیات کا ایک قانون
ہے کہ انسانی ذہن سدا حرکت میں رہتا ہے۔ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بات سوچتا رہتا ہے
ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک صحیح الدماغ شخص کا ذہن جامد ہو جائے یا سوچنا چھوڑ

دے۔سوچ کا یہ عمل بیداری سے ہی خاص نہیں بلکہ سوتے میں بھی جاری رہتا ہے۔اسی وجہ سے ہم خواب دیکھتے ہیں جو انسان سے خاص ہیں کہ جانور اس خاصیت سے محروم ہیں۔اگرچہ حیوانات اور پرندے بھی ذہن رکھتے ہیں مگر خود شعوری کے نہ ہونے کے سبب وہ خواب نہیں دیکھ سکتے۔اور نہ اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں۔اس دور کے انسان کو اپنے مخصوص ذہنی جوہر کے طفیل ہتھیار بنانے، خوارک ذخیرہ کرنے، تن ڈھانپنے اور کتے اور گدھے وغیرہ کو سدھانے میں کچھ زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔لیکن خواب اُس کے لیے بدستور پریشانی کا سبب رہے۔یہ بات ممکن نہ تھی کہ انسان خوابوں کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دے یا خوابوں کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔چنانچہ خارجی مظاہر کے ساتھ ساتھ اس نے داخلی عالم پر بھی غور کرنا شروع کر دیا۔اور اپنی توفیق کے مطابق اسے سمجھنے کی کوشش بھی کی۔وہ دیکھتا کہ سوتے میں اس کا جسم تو غار میں ہے لیکن وہ جنگلوں میں شکار کھیلتا پھرتا ہے یا اپنے مرے ہوئے عزیزوں سے ملاقاتیں کر رہا ہے۔اس عجیب وغریب صورت حال کی یہی توجیہ کی جاسکتی تھی کہ اس کے اندر کوئی ایسی شے موجود ہے جو سوتے ہوئے اس کے جسم سے جدا ہو جاتی ہے اور جاگنے پر لوٹ آتی ہے۔اس کے ساتھ اس کا روزمرہ کا مشاہدہ تھا کہ اس کی زندگی کا انحصار سانس کی ڈوری پر ہے جب تک یہ ڈوری باقی ہے انسان زندہ رہتا ہے اور اس کے ٹوٹ جانے سے وہ مرجاتا ہے۔سانس کی اس ڈوری یا ہوا کے اس جھونکے کو ابتداء میں وہ روح سمجھتا رہا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ روح کے لغوی معنی سانس یا ہوا کا جھونکا ہی رہے مگر اس کے اصطلاحی معنی بدل گئے اور روح کا اطلاق بھوت پریت، چلتی پھرتی کایا، یا ہمزاد پہ ہونے لگا جو انسان کا ہم شکل ہی ہے۔اور انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اُس کا ہمزاد بھی وجود میں آجاتا ہے مگر موت کے بعد اس سے جدا ہو کے کسی نامعلوم عالم کی طرف چلا جاتا ہے۔روح کے

معنوی مفہوم کی یہ تبدیلی بنی نوع انسان کی تاریخ میں بڑی انقلاب آفریں اور دور رس ثابت ہوئی کیونکہ مذاہب عالم کی بنیاد اسی تصور پہ اٹھائی گئی''۔

(1*)

✡✡✡✡✡✡

انسان کے ارتقاء کا سفر انتہائی سست ہے۔ شعور کی منزل یعنی سوچنے اور سمجھنے کے مراحل طے کرتے ہوئے انسان نے تفکر اور تعقل کے بہت سے مدارج حاصل کیے، بہت سے اہداف حاصل کیے۔ علم سماجیات کی بنا رکھی گئی، تحفظ کی خاطر علم حرب وضرب میں مہارت کے بے پناہ انداز اپنائے اور بدلے گئے، یعنی کہا جا سکتا ہے کہ تجسس فطرت انسانی کا ایک لازمی عنصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے شعوری ارتقاء کے ہر ہر مرحلے میں علم کی راہیں اور جہتیں اور علم کے مختلف زاویے انسانی فہم و ادراک اس کے زمانی ومکانی مقاصد سے وابستہ رہے ہیں۔ اگرچہ ہر زمانہ میں علم محدود اور اضافی رہا ہے کہ کوئی علم کبھی مکمل نہیں ہو سکتا کیونکہ علم تو پوشیدہ اسرار کے انکشاف کا نام ہے اور اِن پوشیدہ اسرار کی آخری حد کوئی نہیں جانتا سوائے خالق کے جس نے کائنات اور انسان کو خلق کیا ہے۔ انسان چاہے اس کا تعلق معروف یونانی معاشرے سے ہو جہاں فلسفے کی حکمرانی تھی یا اُس کا تعلق انسان کے اُس عہد سے ہو جہاں وہ اپنے معبود کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا تھا یا اُس کا تعلق انیسوی صدی کے جدید فلسفیانہ رجحانات سے ہو وہ انسان اور کائنات کے باہمی ربط کا عقلی حل نہیں کھوج سکا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُس نے اس اہم انسانی مسئلے کو مذہب یا یوں کہہ لیں کہ الہٰیات سے الگ رکھ کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ نہ کائنات کے اسرار ختم ہوتے ہیں اور نہ انسان کی علمی تشنگی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان محوسفر ہے اُس کا سفر اُس راز کو جاننے تک جاری رہے گا جہاں پہنچ کہ وہ کہہ سکے کہ علم ختم ہو گیا۔ مگر انسان کو یہ منزل کبھی حاصل نہیں ہو سکے گی اس لیے کہ اُس کی یہ آرزو

خالق کی منشا اور منصوبے کے خلاف ہے۔ یونانی فلاسفہ نے انسان اور کائنات کے باہمی ربط کو علم فلسفہ کے تحت حل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کو انسانی تاریخ میں بڑی تبدیلیوں کی صدیاں قرار دیا گیا ہے۔ بلاشبہ انسان نے اِن صدیوں میں فلسفہ سائنس اور تاریخ کے میدانوں میں بہت سے مراحل طے کئے۔ اور علم کی بہت سی نئی جہتوں کو اجاگر کیا جس سے انسان بہتر زندگی کے قابل ہوا۔ مگر بدقسمتی سے یہ صدیاں لادینیت یا خالق سے بیزاری میں بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اس لیے کہ وہ قوم جو صاحب کتاب تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کے لیے چن لیا تھا وہ زروال کی راہوں کی مسافر تھی اور جن قوموں کے نے علم میں ترقی حاصل کی اُن کی دنیا میں ایک ایسی تہذیب کا غلبہ ہے جس کی فکری ونظریاتی بنیادیں خالق کی منشا سے متصادم ہیں۔ چنانچہ اس غالب تہذیب کے سائے میں پروان چڑھنے والے علوم آسمانی ہدایت سے عدم التفات کے نتیجے میں انسانیت کی کوئی راہنمائی نہ کر سکے اور وہ اُس منزل سے ہنوز دور ہے جو مطلوب ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں انسان نے مختلف علوم کی مختلف جہتوں میں جو رنگ بکھیرے ہیں اُن کا عکس چار سو دکھائی دیتا ہے۔ مگر پھر سوال سامنے آ کھڑا ہوگا کہ کیا انسان نے اس مادی ترقی سے مقصد زیست کا تعین کر لیا ہے۔ کیا اُس نے کسی منزل کی نشاندہی کر لی جہاں پہنچ کے وہ آسودگی سے آشنا ہو سکے۔

بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں جن علمی نظریات نے جنم لیا فلاسفہ نے علم کی جو توجیہات کیں انھوں نے انسان کی منزل کے راستوں کا تعین کرنے کی بجائے انھیں اور بھی الجھا دیا ہے اور اب انسان باوجود اُس علم کے جو اُس کا احساس تفاخر ہے منزل کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ چنانچہ انسان کی تخلیق اور کائنات کے نظام بسیط کے پس پردہ حقیقت تک رسائی کے بغیر انسان کا علمی سفر تشنہ ہے اور یہ بات بھی اب کافی حد تک ثابت ہو چکی ہے کہ میسر علمی ذرائع سے اِن امور کی حقیقت تک رسائی ممکن بھی نہیں۔ چنانچہ لامحالہ علم کی کوئی ایسی جہت کھوجنی پڑے گی جو اس اہم سوال کا جواب دے سکے۔ اس سوال کا جواب مسلمان کے پاس ہے۔ قرآن میں موجود ہے

مگر مسلمان اُس علمی حیثیت سے کافی نیچے کھڑا ہے جہاں پہنچ کر وہ با آواز بلند اس بات کا دعویٰ کر سکتا کہ میری بات سنو میرے پاس علم کی جو اساس ہے وہ قابل یقین ہے، ہر انسانی سوال کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتی ہے، مگر علمی روایت سے انحراف کی وجہ سے کوئی اس کی بات سننے کو تیار نہیں اس لیے بھی کہ غالب تہذیب سرے سے اُس نظام علم کی مخالف ہے جس کو اصطلاحاً علم وحی کہا جاتا ہے۔
وہ صدیوں کلیسا کا جبر سہتے رہے اور سمجھتے ہیں کہ مذہب ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ تیرہویں صدی سے سولہویں صدی تک مغرب کے کلیسا نے پیش کیا تھا۔ اس لیے اہل مغرب کے صاحب دانش میں سے چاہے وہ روسو ہو، والٹیر ہو، برگساں ہو، نٹشے ہو، ول ڈیورانٹ ہو، ہسکلے ہو، اگسٹ کومٹ ہو ،سینٹ سائمن ہو، ڈارون ہو اینجلز ہو یا کارل مارکس ہو یا آج کا سب سے بڑا طبعیات دان سٹیفن ہاپکنز ہو مذہب کے نام سے یوں بدکتے ہیں جیسے انھیں کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ چنانچہ خالق کائنات سے یہی بیزاری، الہامیات سے یہی بے اعتنائی اور حقیقت سے یہی تساہل انھوں نے اپنے لوگوں کو منتقل کیا اور اُن کے یہی افکار اہل مغرب کی رگوں میں خون بن کے سرایت کرنے لگے۔
چنانچہ گذری ایک دو صدیوں میں انسان خالق کے اُن نشانات کو بھی بھلا بیٹھا جو اُس نے اپنے آباء سے پائے تھے، وہ قرآن پر تو کیا یقین کرتے انھوں نے تو توارت و انجیل سے بھی منہ موڑ لیا۔ چنانچہ اس پس منظر میں علم نے جو بھی ترقی کی اُس نے انسانیت کے شرف کو بحال کرنے میں قطعی کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ علم کی تدریج کا سفر ابھی جاری ہے اور اُس روز تک جاری رہنے والا ہے جس تک کہ اس کائنات کی بساط کو سمیٹ نہ لیا جائے۔ یہاں ہم اسلام کے اُس سادہ اور سہل تصورِ علم کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اس نے انسان اور کائنات کی غایت بیان کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ!

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ○ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَاخَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 190-191/3)

ترجمہ:

''زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور کرتے ہیں (تو وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں) کہ پروردگار تو نے یہ سب کچھ (کائنات) فضول اور بے مقصد نہیں بنایا اور تو پاک ہے اس سے کہ تُو کوئی عبث کام کرے پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے''۔

✡✡✡✡✡✡

مزید ارشاد ہوا ہے کہ!

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ وَسَخَّرَ لَکُمُ الۡفُلۡکَ لِتَجۡرِیَ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِہٖ وَسَخَّرَ لَکُمُ الۡاَنۡہٰرَ ○ وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ دَآئِبَیۡنِ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ ○ وَاٰتٰکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مَاسَاَ لۡتُمُوۡہُ وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ ○

القرآن الحکیم (سورۃ ابراھیم 32-34/14)

ترجمہ:

''اللہ وہی تو ہے جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے تمھاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے۔ جس نے کشتی کو تمھارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمھارے لیے مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمھارے لیے مسخر کیا کہ لگا تار چلے جارہے ہیں اور رات اور دن کو تمھارے لیے مسخر کیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمھیں دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

آگے فرمایا گیا کہ!

اَوَلَمْ یَرَا لْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہُ مِنْ نُّطْفَۃٍ فَاِذَا ھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَّنَسِیَ خَلْقَہٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ ○ قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ ○ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْہُ تُوْقِدُوْنَ ○ اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ بَلٰی وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ○ اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ○ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ یسین 77-83/36)

ترجمہ:

"کیا انسان دیکھتا نہیں کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کے کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے "کون اِن ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی"۔ اِن سے کہو! انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلے پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اُس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو۔ کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے اِس پہ قادر نہیں کہ اِن جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں جب کہ وہ ماہر خلاق ہے۔ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے، اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو"۔ (2*)

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

اِن چند آیات کے مطالعے سے ہی یہ بات کھل کے سامنے آ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات اس مقصد کے لیے پیدا کی ہے کہ یہاں اپنے نائب انسان کو ایک آزمائش میں ڈالے اور اُسے پرکھے۔ جو اس کسوٹی پہ پورا اترے وہ کامیاب ٹھہرا۔ اور جس نے خالق کی منشا کے خلاف زندگی بسر کی اُس کے لیے جہنم کا عذاب تیار کیا گیا ہے۔ انسان کی پانچ ہزار سالہ جہد وسعی کو سامنے رکھیں کہ اُس نے حیات اور کائنات کی غایت تک پہنچنے کے لیے کس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ قدیم اور جدید فلاسفہ نے اس سوال کو کس قدر گہرائی میں جا کے کھوجا ہے مگر اُن کا طریقہ کار غلط تھا۔ اُن کے علم کی رسائی ناقص تھی اُن کی دلیل میں کوئی وزن نہ تھا۔ اس لیے کہ کائنات کو کھوجنے کے لیے اول خالق کو کھوجنا لازم ہے۔ کائنات کی غایت کو جاننے کے لیے خالق

کائنات کی منشا کو جاننا لازم ہے۔ اسکے بعد راستے کھلتے چلے جاتے ہیں انسان شکر کی اُن راہوں کا مشتاق ہو جاتا ہے جن پہ چل کے وہ خالق کی رضا کو حاصل کر سکے یہی حقیقی علم ہے اور یہی حیات و کائنات کی اصل غایت۔ ایک بار پھر مڑ کے دیکھیں کہ پانچ ہزار سال کی معلوم انسانی تاریخ میں انسان نے خالق کے تصور سے عاری جس فلسفہ علم کو تشکیل دیا اُس نے انسانیت کو کیا دیا؟

روحانی تشنگی کا احساس؟

گمراہی و رذالت کے راستے؟

مادیت کا وہ گہرا غار جس کی تہہ میں کوئی خیر نہیں؟

قومیت کا عفریت؟

مسابقت کے اندھے راستے؟

اشتراکیت کے مصنوعی معاشی فلسفے؟

بڑی بڑی جنگوں میں کروڑوں انسانوں کی ہلاکت؟

اِن جنگوں سے انسان نے یہ سبق سیکھا کہ ایٹم بم بنائے؟

بے مقصدیت کا بارِ گراں؟

بدامنی اور استحصالی نظام معیشت؟

کمزور اقوام سے امتیازی سلوک؟

فحاشی اور عریانی کا سیل بے کراں؟

اخلاقی قدروں سے آزاد معاشرے؟

علم کا تفاخر مگر جہل کے عملی مظاہر؟

بے روح زیست جو کسی منزل کے احساس سے عاری ہے؟

مادی جدوجہد جس کی کوئی آخری حد نہیں؟
یہ کم سے کم بیان ہے اُس انسانی ماحصل کا جو اُس نے خالق سے بے اعتنائی کے بعد کمایا ہے۔

✡ ✡ ✡

علم کا فلسفیانہ مزاج

علم فلسفہ اشیا کی ماہیت کو گہرائی میں جا کر جانچنے کی دعوت دیتا ہے۔ عام طور پہ فلسفیانہ تصور کی بنا مادیت پہ رکھی ہے۔ علم فلسفہ کی ابتداء یونان سے ہوئی۔ حضرت موسیٰؑ کی آمد سے ہزار سال پہلے ہی اس علم کی بنیادی اصلاحات وضع کر لی گئی تھیں۔ فلسفے کا باوا آدم طالیس یونان کے قدیم شہر میلٹس میں (۶۴۰ ق م) پیدا ہوا۔ سائنس ریاضی اور علم ہیت کی ابتداء بھی اسی دور میں ہوئی۔ طالیس ہی کو اِن علوم کا موسس خیال جاتا ہے۔ اگرچہ ریاضی (جیومیٹری) کے بیشتر ابتدائی اصول اقلیدس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ یونان کے معاشرے میں صدیوں سے قائم مذہبی دیو مالا کے اثرات کو فلاسفہ کے عقلی علوم نے رفتہ رفتہ معدوم کر دیا تھا۔ فلسفے کے قبول و رواج کے ساتھ ساتھ ارواح کے مت کے اثرات بھی بتدریج کم ہوتے رہے اور فلسفہ اور مادی سائنس کی روایت غلبہ حاصل کرتی رہی۔ یونانی فلسفے کا اہم موضوع بھی حیات اور کائنات ہی تھا۔ فلاسفہ کے ابتدائی کائناتی تصور میں خالق کا موہوم سا تصور موجود ہی تھا۔ اگرچہ انھی فلاسفہ کی بنیادی فکر کی جب سترہویں اور اٹھارویں

صدی کے فلاسفہ نے تشریحات کیں تو کائنات کو سراسر مادی قرار دے دیا۔ چنانچہ قرن اول کے فلاسفہ میں سے مثالیت پسندوں نے حقیقت کبریٰ کو وجودِ مطلق شعور مطلق، یا عین الاعیون کو جواُن کی فکری کاوشوں کا مقصود منتہا ہے خدا کا نام دیا تھا۔ مثالیت پسندوں کے وجودِ مطلق یا خدا اور اہل مذاہب کے خدا میں البتہ ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ مثالیت پسندوں کا وجودِ مطلق یا خدا واجب الوجود ہے، غیر شخصی ہے جب کہ اہل مذہب کا خدا ذی ارادہ شخصیت ہے جو انھی کی طرح جذبات و احساسات رکھتا ہے اور کائنات میں ہر وقت ہر قسم کے تصرف پہ قادر ہے۔ تاہم مثالیت پسند بھی اہل مذہب کی طرح روح کے وجود اور اُس کی بقاء کے قائل ہیں اور انسان کو فائل مختار مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب ہمیشہ سے تصور روح کا قائل ہے جس کے وسیلے سے انسان کائنات سے اپنا فکری اور جذباتی رابطہ قائم رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اہل یونان کے فلاسفہ کا علمی تخیل اُن کے مذہبی رجحانات سے متعلق ہے اہل علم نے یونان کے فلاسفہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

فلاسفہ کے پہلے گروہ کا آغاز طالیس سے ہوتا ہے۔ طالیس کا نظریہ کائنات یہ تھا کہ کائنات پانی سے بنی ہے۔ طالیس کا کائنات کے متعلق یہ نقطہ نظر اہل یونان کے مذہبی دیو مالا کے خلاف تھا جس کی بہت مخالفت کی گئی۔ تاہم طالیس نے کائنات کی تشریح مذہبی دیومالا کے توہمات سے ہٹ کر عقلی طور پہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس کے تخیل کو اُس کے شاگرد ''اناکسی مینڈرس'' نے آگے بڑھایا۔ چنانچہ طالیس اور اناکسی مینڈرس کے کائنات کے بارے میں اس عقلی نظریے نے رفتہ رفتہ مقبولیت حاصل کر لی۔ بعد میں علم کا یہی اندازِ نظر اس قدر مقبول ہوا کہ دو ہی صدیوں میں سائنس اور فلسفے کی تدوین عمل میں آ گئی۔ فلاسفہ کے اس پہلے گروہ میں جن فلسفیوں کے افکار کو پذیرائی حاصل ہوئی اُن میں اناکسی مینڈرس، زینوفینس، پروٹاگروس، ہپوکریتس، دیماقریطس، ابیقوروس اور لکریشس شامل ہیں۔ فلاسفہ کے دوسرے گروہ کا آغاز فیثاغورث سے شروع ہوا اور پارمی نائیدس، ہیریقلیتس اور افلاطون کے واسطے سے فلاطیونس پہ منتہا ہوا۔ فیثاغورث کروٹونا کا شہری تھا اُس نے عورت اور مرد کی مساوات کا تخیل پیش کیا۔ فیثاغورث نے علم ریاضی اور فلسفے کی مبادیات پیش کیں۔ وہ پہلا شخص تھا

جس نے کہا کہ دنیا گول ہے اُس نے سب سے پہلے سورج گرہن اور چاند گرہن کی تشریح کی۔ فیثا غورث اپنی طرز کا منفرد طبیب تھا جو موسیقی سے لوگوں کے امراض کا علاج کیا کرتا تھا۔ اس کے افکار میں الٰہیات کا عکس پایا جاتا ہے اور وہ تناسخ ارواح کا بھی قائل تھا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مذہبی فلسفی تھا۔ ہیریکلیتس کے کائناتی فلسفے کو یونانی ذہن و دماغ کی عظیم تخلیق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ کائنات کی بنا پانی نہیں بلکہ آگ ہے جسے وہ ''یزدانی آگ'' کہا کرتا۔ پارمی نائیدس سے مابعد الطبیاتی فلسفے کا آغاز ہوا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ کائنات کی ہر چیز ثابت و قائم ہے اور اُس کی کسی شئے کو تغیر نہیں۔ پارمی نائیدس ہی کو مثالیت پسندی کا بانی کہا جاتا ہے اور اُسی سے ظواہر و حقائق کی تفریق اور غیر مرئی حقیقت اور غیر حقیقی ظواہر کے مابین نزاع کا دور شروع ہوا جو انیسویں صدی میں کانٹ کے عہد تک جاری رہا جس کے فلسفے میں نزاع کا یہ سلسلہ عروج تک پہنچ گیا۔ مثالیت پسندوں کا خیال تھا کہ آغاز و انجام، پیدائش و مرگ، کون و فساد صرف ظواہر میں ہوتا ہے۔ حقیقت واحد کا نہ آغاز ہے نہ انجام ہوگا، صرف وجود ہے اور تکوین و تخلیق محض واہمہ ہے۔ وجود واحد یعنی (خدا) کائنات میں ہر کہیں محیط ہے اور ساکن ہے۔ چنانچہ بجا طور پہ پارمی نائیدس کو فلسفہ واحدت الوجود کا اولین شارح قرار دیا جاتا ہے۔

پارمی نائیدس کے بعد لیوکپس کے افکار کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ لیوکپس میلٹس کا شہری تھا۔ لیوکپس دراصل پارمی نائیدس ہی کے افکار کا تسلسل تھا کیونکہ وہ پارمی نائیدس کے علمی تخیل سے متاثر تھا۔ یونان کا مقبول ترین فلسفی دیما قریطس لیوکپس ہی کا شاگرد تھا۔ لیوکپس کے افکار کو آگے بڑھاتے ہوئے دیما قریطس نے پہلی بار کائنات کے بارے میں ایک سائنسی نظریہ پیش کیا جس کے مطابق کائنات کی بنا ذرے (ایٹم) پہ رکھی ہے اور کائنات ایٹموں ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ دیما قریطس کو مادیت پسندوں کا امام بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ انسان کے مادی اور روحانی مجموعے کے تصور کا مخالف تھا اُس نے کہا انسان بھی چھوٹے چھوٹے ذرات یعنی ایٹموں ہی کا مجموعہ ہے اور روح کچھ بھی نہیں۔ موت کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ موت ایٹموں کے منتشر ہو جانے کا نام ہے

دیما قریطس فطرت میں کسی بھی نوع کی مقصدیت اور غایت کا منکر تھا۔ اُسی نے سب سے پہلے یہ فلسفہ پیش کیا کہ ہر سبب کا ایک مسبب ہوتا ہے۔ کہکشاں کو اُس نے ستاروں کا جھرمٹ کہا۔ وہ اپنی قوم کا صاحب دانش شخص تھا لوگ اپنے معاملات کے حل کے لیے اس سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اُس کے بہت سے اقوال مورخین نے رقم کیے ہیں جنھیں ہم طوالت کے خوف سے قلم انداز کرتے ہیں۔ دیما قریطس نے خوشی کا بھی منفرد تصور پیش کیا جس کی اُس سے قبل کوئی مثال نہ تھی۔ اُس کے خیال میں خوشی کا مال و متاع سے کوئی تعلق نہیں بلکہ خوشی براہ راست انسان کے بطون کا معاملہ ہے۔ اس کے بعد ایمپی ویکلس کا دور آتا ہے جس کا نظریہ کائنات کچھ اس طرح کے نظریات پہ مبنی ہے جیسے کہ اُس نے ڈارون کو وہ بنیادیں فراہم کی ہوں جس پہ انیسویں صدی میں ڈارون نے انسانی ارتقا کے متعلق مقبول عام نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ ایمپی ویکلس کہتا ہے کہ انسان کا ارتقاء حیات کی اسفل صورتوں سے ہوا تھا۔ اُس نے انسان کے دورِ وحشت سے تہذیب کی طرف ارتقائی سفر پہ مقالہ تحریر کیا جسے اپنے وقت میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ حیات کے آغاز اور انسانی تہذیب کے مبادیات پہ مباحث کے علاوہ اُس نے پہلی بار کائنات کی وہ تشریح کی جسے بعد کے کئی مذاہب کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُس نے عناصر اربعہ یعنی آگ ہوا پانی اور خاک کو کائنات کی بنیاد قرار دیا۔ جب اُس نے کہا کہ دریائے نیل میں طغیانی نوجوان لڑکی کی قربانی کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ اُس کی وجہ مصر اور حبشہ کے بالائی علاقوں میں ہونے والی بارش پہاڑوں پہ پگھلنے والی برف ہے تو اہل مذہب نے اس کا حصار کر لیا اور لوگوں کو اس کے نظریات سے متنفر کرنے کی کوشش کی۔

سقراط سے پہلے یونانی فلاسفہ کائنات کے مظاہر اور اُس کی تکوین و تخلیق کے آفاقی مسائل پر غور و فکر کرتے رہے۔ سقراط کے عہد میں سوفسطائیوں کا زور تھا۔ سوفسطائی تحریک کے عمومی معنی تو عقلمند کے ہیں۔ وہ صاحبانِ علم کی ایک تحریک تھی جو فن و اظہار کے موضوع پہ لیکچر دیتے اور نوجوانوں کو سیاسی زندگی کے لیے تیار کرتے۔ تاہم سوفسطائی مکتب فکر میں ایک فرد کی سوچ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی یعنی وہ انفرادی سوچ کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک آدمی کے نزدیک وہی سچ ہے جو وہ سوچتا ہے۔ اُن

کے مطابق کسی شئے کی کوئی معروضی حیثیت نہیں ہے بلکہ ہر چیز محض ایک موضوعی وجود ہے۔اُن کے نزدیک انسان کو کسی قانون کا پابند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اُسے آزاد پیدا کیا گیا ہے۔علم کے معاملے میں سوفسطائیوں کا کہنا تھا کہ علم کے مسئلے میں ہر فرد اپنے لیے خود ہی قانون ساز ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ وہ اپنے معاملات کے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہے اور معاشرے کے دیگر شہریوں پہ اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ خود کو آزاد خیال کرتے ۔اخلاقیات اُن کے نزدیک ایک رواجی معاملہ ہے اس لیے انسان کے لیے کسی خاص اخلاقی دائرہ عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔وہ کہتے کہ اخلاقیات پہ مبنی پابندیاں فطرت کے خلاف ہیں۔

قانون کے متعلق اُن کا نقطہ نظر یہ تھا کہ قانون تو کمزور لوگوں کی طرف سے ایک خوف کے تحت بنائے جاتے ہیں تا کہ اُن کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے ورنہ طاقت ور اُن کا حق کھا جائیں گے۔کسی بھی قسم کے قانون کو وہ خلاف فطرت قرار دیتے اور کہتے کہ انسان کا بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی طاقت اور صلاحیت سے جو چاہے حاصل کر لے اُس پہ کوئی قدغن نہیں ہے۔سوفسطائی تحریک کے متعلقین نے مختلف انسانی آرا اور نقطہ ہائے نظر کو تو ملحوظ رکھا مگر انسانوں کے ہاں پائے جانے والے وسیع تر اتفاق رائے کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔اس لیے عہد جدید میں سوفطسائیوں کو بیوقوف کہا جاتا ہے تاہم سوفسطائی تحریک کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ علم کے معاملے پہ غور و فکر کا آغاز ہوا اور علم کو ایک سنجیدہ مسئلے کے طور پہ لیا جانے لگا حالانکہ اس سے قبل یونان کے بڑے بڑے فلسفی علمی معاملات سے پہلو تہی اختیار کرتے رہے اور محض حیات اور کائنات کی تشریح میں محو رہے۔

مذہب کے معاملے میں یونان کے اہل فلسفہ نے کوئی قابل قدر کردار ادا نہیں کیا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اہل یونان جس مذہبی دیو مالا کے پیرو تھے اُس کا عقل کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا اس لیے فلاسفہ جو ہر معاملے میں عقل کی شہادت طلب کرتے تھے فطری طور پہ مذہب سے باغی ہو گئے۔اگرچہ لوگوں کے خوف سے پہلے اور دوسرے دور کے فلاسفہ نے مذہب کے خلاف محاذ آرائی کو اختیار نہیں کیا۔یہ الگ بات ہے کہ چند ہی صدیوں بعد یہود و نصاریٰ نے متعدد تبدیلیوں اور

تحریف کے ذریعے انھی فلاسفہ کے نقطہ نظر کو مذہب کا حصہ قرار دے لیا۔اہل یونان کے فلاسفہ کے دوسرے گروہ کے کائناتی نقطہ نظر کو بھی کچھ اتنا قابل قدر قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ وہ اپنے پیش روؤں کے افکار میں اضافے کا باعث تو ضرور بنے تاہم کسی اساسی تبدیلی کو محسوس نہیں کیا گیا۔چنانچہ سقراط کائنات کے ظواہر کے پس پردہ ایک حقیقت اولیٰ کا قائل تھا اور وہ الٰہیات اور مابعد الطبعیات کا انکاری تھا بلکہ اُس کے افکار اکثر و بیشتر اخلاقیات اور سیاسیات پہ مبنی تھے۔اگر چہ وہ مذہب کے خلاف تھا مگر اُس نے کبھی کھل کے اس کا اظہار نہ کیا تھا اس کے باوجود مذہب پرستوں نے اسے الجھا لیا اور اُس پہ مروّج دیوتاؤں کی طاقتوں سے انکار کا الزام عائد کر دیا گیا۔عدالت میں اُس کا جرم ثابت کر دیا گیا اور اُسے سزائے موت سنا دی گئی۔

جس کے بعد اُس کے شاگرد افلاطون نے نظام فلسفہ کو باقاعدہ مدون کیا اور اسے ایک نظام فکر کی شکل میں پیش کیا۔دنیائے فلسفہ میں افلاطون کو مثالیت پسندی کا شارح اول مانا گیا ہے اس لیے کہ اُس کا کہنا تھا کہ امثال ازلی وابدی ہیں اور غیر متحرک ہیں۔دنیا میں جتنی اشیاء دکھائی دیتی ہیں وہ سب امثال کے عکس ہیں۔مثل اعلیٰ ہی حقیقت اولی ہے۔مثل حقیقی ہے اور مادہ غیر حقیقی ہے اور اپنے وجود کے لیے مثل کا محتاج ہے۔وہ کہتا ہے کہ تمام مادی اشیاء فریب نظر کا کرشمہ ہیں۔امثال کا ادراک بنیادی قوت اشراق سے ہوتا ہے اس لیے افلاطون کو اشرقیت کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔

افلاطون نے خدا کو خیر محض کہا ہے اور اپنے مکالمات میں سقراط کی تین اعلیٰ اخلاقی اقدار خیر حسن اور صداقت سے مفصل بحث کی ہے۔وہ کہتا ہے کہ نیکی کی طرح حسن بھی توافق وتناسب ہی کا دوسرا نام ہے۔افلاطون کے بعد فلاطینوس نے اشراقیت کے نام پر افلاطون ہی کے افکار کی نئے سرے سے تدوین کی اور فلاطینوس ہی پہ اہل یونان کے فلاسفہ کے اُس دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے جس نے علم وعمل اور حیات وکائنات پہ علمی افکار کو اختیار کرنے کی روایت کا آغاز کیا۔اگر چہ اُن کے کائناتی تخیل کو قابل قبول قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم اول اول حیات اور کائنات کے بارے میں علمی تخیل اختیار کرنے کی بنا پہ اہل یونان کی جہد وسعی کو عبث بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔کیونکہ انھوں نے آنے والے

لوگوں کے لیے علم کی روایت کو فروغ دیا۔ بعد کی بہت سی صدیوں میں انھی افکار کو الہامی مذاہب کے سائے میں فروغ حاصل ہوتا رہا۔ اس کے بعد جب انسان بلوغت کی ارفعی حالت کو پہنچا تو اُسے قرآن کی نعمت سے نوازا گیا جس نے حیات اور کائنات کے بارے میں ہر ابہام کو دور کر دیا۔ پھر مسلمان فلاسفہ کا دور آیا جن کے نظریات و افکار لا محالہ قرآن و سنت کی متابعت میں مرتب ہوئے۔ مسلمانوں کی علمی خدمات کو الگ سے بیان کیا جائے گا یہاں ہم فلاسفہ کے اُس عہد پہ کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جس کو فلسفہ اور علم کا نیا دور قرار دیا گیا ہے۔ اس دور میں مذہب بیزاری اور خالق سے بے اعتنائی کا رویہ عمومی طورِ زیست کے طور پہ اپنا لیا گیا تھا جس کے پس منظر میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فلاسفہ کے افکار کار فرما ہیں۔ فلاسفہ کے عہد جدید کا بانی دے کارت کو قرار دیا جاتا ہے۔ وہ فلسفی ہونے کے علاوہ سائنس دان اور علم ریاضی کا بھی ماہر تھا۔ اُس نے اپنی فلسفیانہ جستجو کا آغاز شک سے کیا اور اپنی جستجو کے آخر میں اُس نے وجودیت کے فلسفے کو پیش کیا اور کہا کہ شک سے میرا صرف یہ بات ہے کہ میں ہوں۔ یعنی اُس نے کہا کہ ذہن کا وجود مادے سے زیادہ یقینی ہے اور مادے کو ذہن کے حوالے ہی سے جانا جا سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ خارجی اشیا کا علم حواس سے نہیں بلکہ ذہن سے حاصل ہوتا ہے چنانچہ دے کارت کی یہ موضوعیت جدید فلسفے کی روح میں سما گئی اور مثالیت پسندوں نے خاص طور پہ اسے اپنے منطقی استدلال کا موضوع بنا لیا۔

ازاں بعد روسو کا عہد آیا جس نے عقلی تفکر اور سائنسی نقطۂ نگاہ کی مخالفت کی اُس کے فلسفے کی بنیاد فطرت تھی وہ لوگوں کو فطری قوانین سے مطابقت اختیار کرنے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ اُس نے اہل فرانس کی خرد پرستی اور دانش دوستی کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ روسو کے عہد میں ہی لوگوں کی بہت بڑی اکثریت نے اپنا دامن سائنس اور مادیت پہ استوار نگاہ فکر سے وابستہ کر لیا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ عنقریب انھیں مذہب کی جاہلیت سے نجات مل جائے گی اور وہ مذہبی توہمات سے آزاد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں روشن خیالی اور حقیقت پسندی کا دور دورہ ہو گا۔ چنانچہ لوگوں کے دل کی اس آواز کو گبن اور ہیوم نے استدلالی اور علمی پس منظر فراہم کر دیا جس

سے اُس فلسفیانہ نقطہ نظر کا آغاز ہوا جو خالق کے وجود سے عاری تھا۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے فلاسفہ نے سائنسی بنیادوں پہ ایک نیا مذہب وضع کرنے کا تصور پیش کیا اگرچہ وہ اس میں تو کامیاب نہ ہو سکے تاہم وہ ایک ایسا طورِ زیست وضع کرنے میں ضرور کامیاب رہے جس میں کسی خالق کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ کانٹ ہو یا ہیگل، شیلنگ ہو یا برگساں، دے کارت ہو یا جیمز واٹ، ول ڈیورانٹ ہو یا اینجل ہو، مارکس ہو یا تھامس ہابس اُن کی فکر کے ذیلی عنوانات سے قطع نظر اُن کے نظریات کی کسی ایک مشترک اساس پہ نگاہ کی جائے تو وہ خالق کا انکار ہے۔ چنانچہ خالق کے انکار پہ اِن فلسفیوں نے علم کی جو عمارت تعمیر کی وہ ریت کا ایک ایسا قلعہ ہے جو علم قرآن کے ہلکے سے جھونکے سے ہی زمین بوس ہو جائے گا مگر صد افسوس کہ اہل قرآن ابھی غفلت میں ہیں۔ اللہ ہمیں ہدایت سے نوازے۔(3*)

✡ ✡ ✡

علم کا صوفیانہ مزاج

تصوف سے صوفی ازم کی بنیاد پڑی۔ طریقت صوفی ازم کا دستور ہے۔ اگرچہ تصوف کی تاریخ بہت قدیم ہے تاہم اسلام میں رائج تصوف اسلام کی اجلی اور سفید چادر پہ سیاہ اور بدنما دھبے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تصوف کی بنیاد راہبانیت ہے اور راہبانیت اسلام کی ضد ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ دین میں جو کچھ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے زائد ہے وہی تصوف ہے۔ اس لیے کہ جب قرآن حکیم میں اس امر کو واضح کر دیا گیا کہ انسان کی آنکھیں اُس ذاتِ باری تعالیٰ کو نہیں پا سکتیں تو پھر قرآن کی ضد میں شوق وصال کی منزلوں کو کیا نام دیا جائے۔ مشاہدہ حق کی خاطر چلہ کشی رجال غیب سے روابط کے دعوے، کشف و مشاہدات کے کرشمے، آئینہ باطن کی صفائی کا تخیل، سمع و وجد کے طریق، دین طریقت کے اندھے نظریات، ترک لذات کی روایت، خواہش نفس سے اجتناب، ترک اکل ونوم، فہرست حلال سے انکار، کشف وکرامات، حالت سکر اور مکاشفات، نظریہ حلول کی تقرار، ولایت ونبوت کا تقابل، عشق وسرمستی کے مظاہر جیسے تمام امور کا اسلام کے ساتھ

سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ بلکہ یہ سب امور وہ زوائد ہیں جن کا نہ تو رسول اللہ ﷺ کی مبارک زیست سے کوئی حوالہ پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں اس طرح کا کوئی چلن ثابت کیا جاسکتا ہے۔

اور قرآن تو بہ بانگ دہل کہہ رہا ہے۔

وَ رَهْبَانِيَّةَنِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۔

القرآن الحکیم (سورۃ الحدید 27/57)

ترجمہ؛

"اور انھوں نے لذات سے کنارہ کشی کی خود ایک نئی بات نکال لی، جس کا ہم نے اُن کو حکم نہیں دیا تھا مگر انھوں نے (اپنے خیال کے مطابق) خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (خود ہی ایسا) کر لیا تھا، پھر جیسا اس کو نباہنا چاہیے تھا نباہ بھی نہ سکے۔ پھر جو اُن میں سے ایمان لائے اُن کو ہم نے اُن کا اجر دیا اور اُن میں سے زیادہ نافرمان ہی ہیں۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

دستورِ تصوف جس کو عرف عام میں طریقت کہا جاتا ہے وہ شریعت اسلامی سے زائد ایک ایسا دستورِ عمل ہے جس کی بنیاد میں انسان کی خواہش نفس کارفرما ہے۔ چنانچہ لوگوں نے دین اسلام میں وہ بہت سے امور وضع کر لیے جو اسلام کی ضد ہیں۔ تاریخ مذاہب کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی دین میں جب بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ابتداء ہمیشہ مقدس اور نیک آرزوؤں سے ہی

ہوتی ہے۔انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے لیے بھلائی کے کسی تصور سے سیر نہیں ہوتا اور کامیابی کی ہر منزل کو جلد از جلد حاصل کرنے کی خواہش پالتا رہتا ہے۔علم تصوف کی بنیاد اس مفروضے پہ رکھی گئی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے آخرت میں جمع کر رکھا ہے اُس کا کچھ حصہ اسی دنیا میں حاصل کر لیا جائے۔چنانچہ اُس نے غیب کے پردوں کے اس پار جھانکنے کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں ۔تب اُس نے جانا کہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادیت ہے ،خواہش نفس ہے۔چنانچہ لوگوں کے اس گروہ نے خود پہ ہر اُس چیز کو حرام کر لیا جسے اللہ اور اُس کے رسول نے مسلمانوں کے لیے حلال قرار دیا تھا۔وہ اپنی بیویوں سے دور رہنے لگے،اپنے بچوں کو پہچاننے سے انکار کرنے لگے ،اپنے ساتھیوں سے بے اعتنائی برتنے لگے ۔اپنے فرائض سے کوتاہی کی روش اختیار کر لی،اس کے بعد انھوں نے سماج سے منہ موڑ لیا اور دور جنگلوں اور ویرانوں میں جا کر اُس مشقت میں پڑ گئے جس کی انھیں کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی اُن کو اس امر کا حکم دیا گیا تھا۔

علم تصوف کی بنیاد ترک دنیا،ترک لذات،ترک حلال اور ترک مباہات پہ رکھی ہے۔اس مشقت سے اُن کا مقصود خدا کی تلاش تھا مگر عجیب بات ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جو طریقہ امت کو سکھایا امت کے اس گروہ نے اسے یکسر بھلا دیا اور خدا کی تلاش میں ہوائے نفس کی خواہش کو رسول اللہ ﷺ کے طریقے پہ ترجیح دی۔انھوں نے خدا تک پہنچنے کے ایسے طریقے ایجاد کیے جن کا کوئی ثبوت قرآن وحدیث سے نہیں ملتا۔انھی طریقوں کی تفصیلات کو طریقت کہا گیا۔بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ طریقت یا تصوف دین اسلام سے متعلق کوئی چیز ہے حالانکہ تصوف کی تاریخ تو اسلام سے کئی ہزار سال قدیم ہے۔

اول اول یونانیوں کے ہاں کچھ ایسے لوگوں کا پتہ چلا ہے جو دنیا کو ترک کر کے جنگلوں اور ویرانوں کو نکل جاتے تھے ۔وہ جادو کا عمل سیکھتے اور لوگوں کی گمراہی کا سامان کرتے ۔اہل یونان نے جب مذہب نصرانیت اختیار کیا تو تصوف کی کئی صورتیں اُن میں مروّج تھیں۔ چنانچہ یونانی فلسفہ کے ساتھ ساتھ تصوف کی بھی کئی صورتیں دین عیسوی میں منتقل ہو گئیں ۔ یہودیوں میں اگرچہ حضرت

موسیٰ کی تعلیمات پہ پختگی سے قائم رہنے والا ایک طبقہ بھی موجود رہا مگر اُن کی اکثریت نے دین میں بگاڑ کو رواج دیا۔ چنانچہ اہل نصاریٰ کے راہبوں اور یہودیوں کے ربیوں نے لوگوں سے کہا کہ نجات کا رستہ اجتناب میں ہے۔ چنانچہ دین نصرانیت میں راہبانیت رواج پانے لگی۔ یاد رہے کہ دین عیسوی میں بھی راہبانیت کو انھوں نے اللہ کے حکم سے اختیار نہ کیا تھا بلکہ انھوں نے اس راہ کو خواہش نفس کی بنا پہ اختیار کر لیا تھا۔ اُن لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ روحانیت کے راستے میں حائل سنگ راہ ہمارا مادی جسم ہے۔ لہٰذا اس جسم کو مضمحل اور کمزور بنانے کے لیے طرح طرح کے عذاب دیئے جانے لگے۔ کم سے کم کھانا، کم سے کم پینا کہ جس سے بمشکل جسم و روح کا نظام قائم رہ سکے۔ کم سے کم سونا دنیوی لذات جن سے فائدہ اٹھانے کا خدا نے انھیں حق دیا ہے اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا۔ شدید سردی میں ننگے بدن رہنا اور باہر رہنا، اور کہیں شدید گرمی میں خود کو دھوپ میں باندھے رکھنا، کئی کئی دن تک ایک ہی جگہ کھڑے رہنا اور ایک ہی پاؤں پر کھڑے رہنا، کیچڑ میں پڑے رہنا، چپ کا روزہ رکھنا اور اس طرح کی سینکڑوں اذیتیں ہیں جن کی تفصیل لامحدود ہے جو وہ خود کو پہنچاتے اور بزعم خود اُن کے یہ سارے اعمال خدا کی خوشنودی کے لیے ہوتے کہ شاید انھیں خدا کا دیدار ہو جائے۔

اُن میں سے بعض اپنے جسموں پہ زخم کر لیتے اور اُن کا کوئی علاج نہ کرتے حتیٰ کہ اُن میں کیڑے پڑ جاتے اور جب اُن کیڑوں میں سے کوئی کیڑا زخم سے پھسل کر نیچے آ گرتا تو اُسے اٹھا کے دوبارہ زخم پہ رکھ دیتے اور کہتے کیوں اپنی خوراک سے انکاری ہو۔ گویا اپنی جان سے دشمنی تصوف کا پہلا اصول ٹھہرا۔ چنانچہ جسم کی تعذیب اور اس کے تقاضوں کی تکذیب کے ذریعے وہ اپنے جسم کو تحلیل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے۔ اِن لوگوں کا دوسرا قدم دنیا والوں سے قطع تعلق تھا۔ یہ لوگ اپنے لیے کوئی گوشہ تنہائی چن لیتے یا پھر باہر جنگلوں اور ویرانوں کو نکل جاتے۔ اس لیے کہ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح وہ لوگوں سے دور اور خدا سے نزدیک ہو جائیں گے۔ وہ سمجھتے کہ اُن کے معاشرتی تعلقات اُن کو خدا سے دور لے جا رہے ہیں چنانچہ وہ دنیا سے الگ تھلگ اور دور ویرانوں میں اپنا ٹھکانہ بناتے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ عیسائیت سے راہبانیت ہندوؤں میں منتقل ہوئی اس لیے کہ ہندوازم

نصرانیت سے قدیم مذہب ہے۔تاہم اِن دونوں کی راہبانیت میں بہت سے امور مشترک ہیں۔ ہندومت کے راہنماؤں نے انسان کی عمر کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور عمر کے آخری حصے میں راہبانیت کو لازم قرار دیا ہے۔تاہم چونکہ ہندوازم کوئی مربوط اور مدون مذہب نہیں ہے اس لیے ہندوؤں کے ہر شہر کا دیوتا الگ ہے اور ہر شہر اور علاقے کے رسم و رواج بھی الگ الگ ہیں۔اور ہندوؤں میں بہت سے فرقے ہیں، جن میں چولی مارگ، بھکشو، سنیاسی اور جوگی ہیں جو جنگلوں اور ویرانوں میں رہتے اُن کا مقصد شکتی (طاقت) حاصل کرنا ہوتا۔پھر بدھ ازم ہے جس کی بنیاد ہی راہبانیت پر ہے۔بدھ تو سارے کے سارے راہبانیت پہ عمل پیرا تھے۔ہندوستان کی سرزمین میں جب اسلام پہنچا تو وہ خالص تھا اور بغیر کسی ملاوٹ کے لوگ اللہ کی توحید پہ کاربند تھے۔پھر لوگوں نے دین میں ملاوٹ کردی اور طریقت کے دستور اپنا لیے۔قبریں بنالیں مزار بنالیے اور اُن کی پوجا کی جانے لگی۔اور یہ وہ امور ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔بلکہ یہ سب امور دین اسلام کی ضد ہیں کہ دین اسلام تو دین توحید ہے اور اِن سب امور سے شرک کی بو آتی ہے۔انسان سوچے تو اہل قریش اور رسول اللہ ﷺ کا کیا اختلاف تھا یہی کہ وہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کرتے تھے تو چاہے کسی بت کو اللہ کی ذات میں شریک کرلیں یا کسی قبر کو اللہ کی صفات میں شریک کرلیں تمام صورتیں شرک ہی کی صورتیں ہیں اور شرک وہ ظلم عظیم ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم میں بصراحت بیان کردیا گیا کہ روز محشر میں جس کو چاہوں گا بخش دوں گا مگر کسی مشرک کو ہرگز معاف نہ کروں گا۔

اسلام میں راہبانیت کے اولین نشان دوسری صدی ہجری میں ملتے ہیں۔تاہم اُس وقت مسلمان اپنے عقائد میں پختہ تھے۔انھیں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات زبانی یاد تھے اس لیے وہ راہبانیت کو دین کی ضد سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ جس بات سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا اُس کو اختیار کرنا دراصل دین سے ہی انکار ہے۔چنانچہ خیر القرون میں عبداللہ بن سبا اور اُس کے پیروکاروں کو کافر قرار دے دیا گیا اور امت کے اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا مگر پھر یہ سلسلہ نہ رُک سکا۔امت کا

پہلا شخص جس نے فقر و فاقہ اختیار کیا اور نفلی عبادت میں غلو کا شکار ہوا اُس کا نام حارث بن اسد محاسبی بیان کیا گیا ہے(4*)۔ اُس کا باپ رافضی تھا اُس نے اپنے باپ کی میراث لینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب یونانی فلسفے کا اثر اسلامی نظریات پہ محسوس کیا جانے لگا تھا۔ حارث بن اسد نے علم کلام کے سلسلے میں بعض مسائل پہ گفتگو کی۔ وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہم عصر تھا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو پہلے حارث بن اسد سے ملتے رہتے تھے حارث کے نظریات میں تبدیلی، تصوف کی طرف اُس کے رجحان کی وجہ سے انھوں نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ صوفی کی اصطلاح بھی دوسری صدی ہجری ہی کی ایجاد ہے سب سے پہلا شخص جو صوفی کے نام سے مشہور ہوا۔ اُس کا نام ابو ہاشم محمد بن احمد الصوفی تھا۔ صوفی کے لفظ کی کئی توجیہات بیان کی جاتی ہیں تاہم راجح یہی ہے کہ چونکہ وہ لوگ اون کا موٹا کپڑا پہنتے تھے اور خرقہ یا گدڑی اُن کا شعار بن چکی تھی لہٰذا یہ لوگ صوفی کہلائے۔ صوفیا کے مخصوص نظریات و عقائد بھی اسی دور کی پیداوار ہیں (5*)۔

تیسری صدی عیسوی کے اواخر میں ابو عبداللہ الحکیم ترمذی (م 268ھ) نے تصوف پہ پہلی کتاب لکھی جس کا نام "ختم الولایۃ" تھا۔ اس کتاب میں بہت سے خلاف شریعت امور وضع کیے گئے اُس نے کہا کہ جس طرح انبیاء کے سلسلے کا اختتام ہوتا ہے اسی طرح اولیاء کے سلسلے کا بھی اختتام ہوتا ہے اُس نے تصوف کے بعض مسائل پر بھی اپنا خاص نقطہ نظر پیش کیا۔ علمائے وقت نے اُس کی مدافعت کی اور بہت بڑی شورش برپا ہوئی۔ بلآخر اُس کو کافر قرار دے دیا گیا اور اسے ترمذ سے جلاوطن ہو کے بلخ میں پناہ حاصل کرنا پڑی۔ یاد رہے کہ منصور حلاج اور ابو عبداللہ ابو الحکم ہم عصر تھے۔ ابو عبداللہ ابو الحکم کے نظریات پہ ابن عربی نے مزید حاشیہ آرائی کی اور حد ہی کر دی اُس نے کہا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے بعد میں اُس نے خود کو اولیا کے سلسلے کا آخری ولی قرار دے دیا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔ لوگ گمراہ ہوتے رہے دین میں ملاوٹ بڑھتی رہی۔ اور تصوف کے مقدمات لوگوں میں مقبولیت حاصل کرتے رہے۔ علماء نے رہبانیت کی کشش کی وجوہات پہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کہنا غلط ہو گا کہ قرآن و حدیث میں دنیا سے بے رغبتی کے بارے میں جو

ارشادات پائے جاتے ہیں وہ رہبانیت کی بنیاد ہیں کہ اِن ارشادات کو سمجھنے والے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب تھے لیکن اُن کی زندگیوں میں رہبانیت کا کوئی عکس نہیں پایا جاتا۔ بلاشبہ دنیا اور اُس کے مال و اسباب سے بے رغبتی بھی دین کا ایک حصہ ہے لیکن یہ پورا دین نہیں کہ معاشرتی، معاشی اور عائلی حقوق اور ان کی ذمہ داریاں زندگی کا اہم حصہ ہیں جو اِن ترغیبی ارشادات سے ساقط نہیں ہوتیں۔ بلکہ رہبانیت کو اختیار کرنے کے بہت سے دیگر اسباب ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ دنیا کے جھمیلوں میں پھنس کر کبھی یکسوئی کے ساتھ روحانی ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اُن کا خیال ہے کہ روحانی ترقی کا کوئی راستہ دنیا کے اندر سے ہو کر نہیں گزرتا لہٰذا درویش قسم کے لوگ اسے نیکی سمجھ کے اختیار کر لیتے ہیں۔ جب کہ اسلام صرف ایسی روحانی ترقی کا قائل ہے جس کا راستہ دنیا کے اندر سے ہو کر نکلتا ہو۔ اگرچہ یہ روحانی ترقی تھوڑی ہو یا بہت بہرحال مقبول ہے اس لیے کہ وہ شریعت کی حدود کے عین مطابق ہوگی۔ چنانچہ اگر کوئی شخص روحانیت کی ترقی کے لیے وہ امور اختیار کرتا ہے جس میں شرع کی حدود کو پھلانگ جاتا ہے تو ایسی ترقی کی اسلام میں کوئی حیثیت نہ ہوگی۔

اب چاہے وہ ہندو جوگی بن جائے یا سادھو اسلام کو اُس سے کوئی غرض نہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں نے روحانی مدارج حاصل کرنے کے لیے کشف اور مراقبے کا طریقہ اپنایا ہے۔ یہ لوگ عالم ارواح یا رجال الغیب سے تعلق قائم کرتے ہیں، چلہ کشی کرتے ہیں، کبھی وہ کسی کنویں میں کئی روز تک الٹے لٹکے رہتے ہیں تو کبھی سردی کی یخ راتوں میں دریا کی سرد لہروں میں ایک ٹانگ پہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی یہ لوگ گندگی نگل جاتے ہیں تو کبھی کئی کئی سال تک نہ بالوں میں کنگھی کرتے ہیں اور نہ ہی کپڑے بدلتے ہیں اُن کے جسموں کی بو دور دور تک جاتی ہے اور سادہ لوح لوگ انھیں اہل علم خیال کرتے ہوئے اِن کی تعظیم کرتے ہیں۔ کبھی اندھیری راتوں میں قبروں پہ ڈیرا ڈالے بیٹھے ہوتے ہیں تو کبھی اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں کہ لوگ انھیں لعنت و ملامت کریں۔ یہ لوگ کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں عورت یعنی اپنی بیوی سے الگ ہو جاتے ہیں اور یہ سب امور شریعت اسلامیہ کے

خلاف اور دستور طریقت کے مطابق ہیں۔اس لیے جب اِن لوگوں سے کہا جائے کہ تم تو خود کو مسلمان کہتے ہو تو وہ نام نہاد باطنی علم کے حوالے دیتے ہیں۔اِن لوگوں کو قرآن حکیم کے احکامات اور ارشادات نبوی کی چنداں پرواہ نہیں ہوتی بلکہ اُن کے نزدیک اُن کے شیخ کی بات قرآن وسنت سے اولیٰ ہے۔اسی ذہنیت کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ!

''اپنی جانوں پہ سختی نہ کرو۔کیونکہ ایک قوم نے اپنی جانوں پہ سختی کی پھر اللہ نے بھی اُن پہ سختی کی۔(یعنی اُن کی ایجاد کردہ معیار عبادت ہی اُن کی جانچ کے لیے مقرر کر دیا گیا)اس قوم کا بقایا گرجوں اور خانقاہوں میں ہے (پھر آپ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ)لوگوں نے راہبانیت کو خود ہی اختیار کر لیا اللہ نے تو انھیں اس قسم کا کوئی حکم نہ دیا تھا''۔ (6*)

✡✡✡✡✡✡

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بلاشبہ دین آسان ہے کوئی شخص دین میں (اپنے آپ پر) سختی نہ کرے کہ وہ عمل (اسے بعد میں) عاجز کر دے۔پس ہر عمل ٹھیک طرح بجالاؤ اور میانہ روی اختیار کرو اور خوش ہو جاؤ اور صبح وشام اور آخری رات کے کچھ حصے میں اللہ سے مدد طلب کرتے رہو۔''(7*)

✡✡✡✡✡✡

دستورِ طریقت میں قلب کی صفائی کے لیے یہ لوگ طرح طرح کی مشقتیں کرتے ہیں تب انھیں کچھ نہ کچھ حاصل ہو ہی جاتا ہے۔مگر یہ کچھ نہ کچھ کبھی حاصل خیر نہیں ہوتا بلکہ انھیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ

شیاطین کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے۔چنانچہ شیطان سے حاصل کی گئی کچھ شعبدہ بازیاں دکھا کر یہ لوگ خود کو دوسروں سے ممتاز قرار دے لے لیتے ہیں اور مشاہدہ حق کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ جو ایک بہت بڑا دعویٰ ہے حالانکہ اُن کے دامن سے تو ایمان تک رخصت ہو چکا ہوتا ہے اور وہ ملائے اعلیٰ اور ذات باری تعالیٰ سے اتصال کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ نے فرما دیا کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے تو اب چاہے کوئی ہمیں ہوا میں اُڑ کے دکھا دے ہم اُس کے نظریہ کو رد ہی کریں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کو راہبانیت سے اجتناب کی جو تعلیم دی وہ بالکل واضح ہے اور اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی زبان اطہر سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ موجود ہے، سلامت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد بھی کوئی شخص جہل کی اُس وادی میں اترنا چاہے جس کو تصوف کہتے ہیں تو اُس کی مرضی ہے کہ انسان کو خیر وشر کے مابین اختیار جو دے دیا گیا ہے۔

صحابہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کسی غزوے پہ تشریف لے گئے۔ راستے میں کسی جگہ قیام فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے دیکھا ہے، ایک غار ہے جس میں انسان آرام وسکون کے ساتھ رہ سکتا ہے، ساتھ ہی ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ رواں ہے ہر سو پھل دار درختوں کی کثرت ہے۔ انھوں نے یہ سب دیکھا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عرض کی:

یا رسول اللہ ﷺ! مجھے ایک غار مل گیا ہے جس میں رشتہ حیات برقرار رکھنے کے تمام لوازم موجود ہیں آپ ﷺ مجھے اجازت دیں تو میں یہیں رُک جاؤں اور گوشہ نشین ہو جاؤں۔

رسول اللہ ﷺ نے فوراً فرمایا:

نہیں! میں یہودیت اور نصرانیت لے کر نہیں آیا میں تو دین ابراہیم لے کر آیا ہوں جس میں سہولت اور آسانی ہے۔ (8*)

✡✡✡✡✡✡

اسی ضمن میں ایک اور روایت میں ہے کہ:

حضرت عثمان بن مظعونؓ رسول اللہ ﷺ کے مقرب صحابی تھے۔انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے اعضائے شہوت کو کاٹ ڈالیں یا خصی ہو جائیں۔ دنیا کی تمام لذتوں کو ترک کر دیں اور تارک دنیا ہو جائیں۔

رسول اللہ ﷺ کو اِن باتوں کا علم ہو تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو طلب کیا اور فرمایا:

جو شخص جان بوجھ کر اپنے اعضائے شہوت کو فنا کرے گا وہ میری امت میں نہیں اٹھے گا۔کیا تمھارے لیے میری ذات کا اسوہ کافی نہیں کہ میں نکاح بھی کرتا ہوں اپنی بیویوں کے پاس بھی جاتا ہوں گوشت بھی کھاتا ہوں۔روزے بھی رکھتا ہوں افطار بھی کرتا ہوں۔

بیان کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی فہمائش کے بعد حضرت عثمان بن مظعونؓ اپنے ہر اس ارادے سے باز آ گئے جس کو رسول اللہ ﷺ نے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

(9*)

✡✡✡✡✡✡

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ بڑے زاہد و عابد تھے۔اُن کو عبادت کا اس قدر شوق تھا کہ ساری ساری رات نوافل میں گزار دیتے۔اور سارا سارا دن روزے سے رہتے ۔وہ اپنے اہل و عیال سے دور ہو گئے اور ہمہ وقت یادِ الٰہی میں گزارنے لگے۔وہ دنیا

سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔

اُن کے والد حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے بیٹے کی اس رہبانیت سے پریشان تھے انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت عبداللہؓ کی شکایت کی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو طلب کیا اور اُن کے شب و روز کے بارے میں استفار کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو سچ تھا وہ کہہ دیا۔

تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عبداللہؓ یہ سب چھوڑ دو اور میرا طریقہ اختیار کرو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے دریافت کیا رسول اللہ ﷺ آپ کا طریقہ کیا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''روزہ بھی رکھا کرو، ناغہ بھی کیا کرو، رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو کیونکہ تمھارے جسم کا بھی تم پہ حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی تم پہ حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پہ حق ہے، تمھارے مہمانوں کا بھی تم پہ حق ہے، تمھارے دوستوں کا بھی تم پہ حق ہے، ہمیشہ روزہ رکھنا تو ایسے ہے جیسے کسی نے روز رکھا ہی نہ ہو، چنانچہ مہینے میں تین روزے رکھ لینا کافی ہیں اور یہ تین روزے ایسے ہیں جیسے تو نے ہمیشہ روزہ رکھا ہو۔ اور مہینے میں ایک قرآن ختم کر لیا کرو یہ کافی ہے۔

حضرت عبداللہؓ نے عرض کی:

یا رسول اللہ ﷺ میں اس سے زیادہ کی قدرت رکھتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

پھر تم داؤدؑ کا طریقہ اختیار کر لو۔ جو ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک روز ناغہ کرتے تھے اور سات راتوں میں قرآن ختم کر لیا کرو۔

حضرت عبداللہؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نہیں اس سے زیادہ نہیں۔

حضرت عبداللہ خاموش ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا۔

(10*)

✡✡✡✡✡✡

حضرت عثمان بن مظعونؓ ہی کے بارے میں ایک اور روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ کو علم ہوا کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز پڑھتے ہیں اور دن بھر روزے سے رہتے ہیں۔عبادت کے لیے انھوں نے گھر میں ہی ایک حجرہ بنالیا تھا۔وہ بیوی بچوں سے بے نیاز ہو چکے تھے، وہ حجرے میں ہی معتکف رہا کرتے تھے۔رسول اللہ ﷺ کو اُن کے اس طرزِ عمل کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ اُن کے گھر تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ اپنے حجرے میں ہی مقیم ہیں اور عبادت میں مشغول ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اُن کے حجرے کی چوکھٹ میں کھڑے ہو گئے اور حضرت عثمان بن مظعونؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

اے عثمانؓ: اللہ تعالیٰ نے مجھے رہبانیت کے لیے دنیا میں نہیں بھیجا۔اللہ کے نزدیک دین حنیف ہی تمام ادیان سے بہتر ہے یہ آسان بھی ہے اور سہل بھی۔

✡✡✡✡✡✡

یہی روایت مسند ابی داؤد میں ذراسی تبدیلی کے ساتھ درج ہوئی ہے کہ:

بیان کیا گیا ہے رسول اللہ ﷺ کو حضرت عثمان بن مظعونؓ کی عبادت کا حال معلوم ہوا

تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو طلب کیا اور فرمایا:
عثمانؓ! کیا تم کو میری سنت پہ عمل کرنا پسند نہیں۔
حضرت عثمانؓ نے جواب دیا :
یارسول اللہ ﷺ: میرے ماں باپ آپ پہ قربان ہوں آپ کی سنت ہی تو مشعل راہ ہے۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو سنو
میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزے بھی رکھتا ہوں افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، عثمان اللہ سے ڈرو۔ تمہاری بیوی کا بھی تم پہ حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی تم پہ حق ہے، تمھارے نفس کا بھی تم پہ حق ہے، اس لیے تم روزہ بھی رکھو، اور افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو۔
(11*)

✡✡✡✡✡✡

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:
ایک بار میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں ایک جوان آدمی ہوں میں اپنے نفس سے پریشان ہوں کہیں میں گناہ میں ملوث نہ ہو جاؤں۔ میں شادی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ مجھے خصی ہونے کی اجازت دی جائے۔
رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی بات کو سنا: مگر سکوت اختیار کیا۔
حضرت ابو ہریرہؓ نے دوبارہ عرض کی:
رسول اللہ ﷺ پھر بھی خاموش رہے:

حضرت ابو ہریرہؓ نے پھر اپنی بات کہی۔

تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ابو ہریرہؓ! اللہ کا حکم اٹل ہے جو ٹل نہیں سکتا۔

یعنی تمہارے خصی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو اللہ کو منظور ہو گا وہ ہو کے رہے گا ۔ پھر جلد ہی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہؓ کے لیے ایسے سامان پیدا کر دیا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی شادی ایک امیر خاتون سے ہو گئی۔

✡✡✡✡✡✡

ابن سعدؒ نے اس ضمن میں یہ روایت بیان کی ہے کہ:

حضرت کہمس الہلالیؓ رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے۔ وہ مدینہ سے کہیں دور دراز کے رہنے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے مبلغین کی دعوت پہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

اس کے بعد وہ مدینہ تشریف لائے اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پہ اپنے اسلام کی تجدید کی۔ اس کے بعد واپس چلے گئے۔ اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔

وہ عبادت سے بہت محبت کرتے تھے اس لیے اپنے وطن گئے تو دن رات عبادت میں مشغول ہو گئے۔ وہ رات بھر نوافل پڑھتے رہتے، دن کو روزہ رکھتے۔ اور اسی معمول پہ طویل عرصہ تک قائم رہے جس کی وجہ سے اُن کی صحت بہت گر گئی۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔

کوئی ایک سال بعد رسول اللہ ﷺ سے ملنے کے لیے مدینے تشریف لائے۔

رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا مگر رسول اللہ ﷺ اُن کو نہ پہچان سکے اس لیے کہ اُن کی حالت ہی بدل گئی تھی شدید مشقت کی وجہ سے وہ بہت لاغر ہو گئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا ؟تم کون ہو۔

انھوں نے جواب دیا:

یا رسول اللہ ﷺ میں پچھلے سال ہی تو آپ سے ملا تھا اور اسلام قبول کیا تھا کیا آپ مجھے بھول گئے ہیں میرا نام کہمس الہلالی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو یاد آ گیا۔تاہم آپ ﷺ نے فرمایا:

مگر تمہیں ہوا کیا ہے؟

حضرت کہمسؓ الہلالی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ سب تو عبادت کی کثرت کی وجہ سے ہوا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے قدرے غصے سے انھیں مخاطب کیا اور فرمایا:

تمھیں اس قدر تکلیف اٹھانے کا حکم کس نے دیا تھا۔

پھر میں کیا کروں۔حضرت کہمسؓ نے سوال کیا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

پورے مہینے میں بس ایک روزہ کافی ہے۔

حضرت کہمسؓ نے فرمایا مگر میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

چلو تین سہی مگر اس سے زیادہ نہیں۔(12*)

✡✡✡✡✡✡

اسی طرح ایک دفعہ کچھ صحابہ ازواج مطہرات کے پاس حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی عبادت کے متعلق دریافت فرمایا:

رسول اللہ ﷺ کی بیویوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز بھی پڑھتے ہیں سوتے بھی

ہیں۔گھر کے کام بھی کرتے ہیں اور دیگر امور میں بھی مشغول رہتے ہیں۔

صحابہ کا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ بہت زیادہ عبادت کرتے ہوں گے مگر انھیں یہ جان کے حیرت ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ اس قدر عبادت نہیں کرتے جس قدر کہ اِن کا خیال تھا۔

تاہم پھر انھوں نے سوچا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت اللہ تعالیٰ نے اُن کے تمام گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔

چنانچہ انھوں نے آپس میں اس بات کا تذکرہ کیا۔

پھر اُن میں سے ایک بولا:

میں تو اب دن رات اللہ کی عبادت میں ہی گزاروں گا تا کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔

دوسرا بولا:

میں تو اب مسلسل روزے رکھوں گا حتی کہ میرا رب مجھ سے راضی ہو جائے۔

تیسرا بولا:

میں عمر بھر شادی نہیں کروں گا بلکہ ہمیشہ اللہ کی عبادت کروں گا۔

رسول اللہ ﷺ حجرے کے اندر ہی تھے اپنے اِن صحابہ کی باتوں کو سن رہے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے آواز دے کہ اِن تینوں صحابہ کو بلا لیا۔

نبی اکرم ﷺ نے اِن سے فرمایا:

''واللہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، مگر میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو یاد رکھو تم میں سے جو میرے طریقے پہ نہیں چلتا وہ میری جماعت سے خارج ہو گیا''۔

(13*)

✡✡✡✡✡✡

رہبانیت کے حوالے سے بہت سی حدیثیں ہیں۔ہم نے تو صرف انتخاب پیش کیا ہے۔یاد رہے کہ ہندوؤں کے قریب ہونے کی وجہ سے ہم پاکستانی مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کی تعلیمات میں قدرے تفاوت آ گیا ہے۔اور ہم بہت سے اُن لوگوں کو جانتے ہیں جنھوں نے ہندوؤں سے جوگی ازم کو اپنایا اور راہبانیت کی طرف مائل ہوئے۔سادہ لوح مسلمان انھیں قابل عزت اور صاحب تقویٰ جانتے ہیں،حالانکہ اُن کے منکوں اور گندے کپڑوں سے آتی بو ہی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم طہارت سے کس قدر دور ہیں۔یہی معاملہ کچھ طریقت کا بھی ہے کہ بعض نادانوں نے شریعت کی موجودگی کے باوجود طریقت کے رسم ورواج کو وضع کیا اور لوگوں کی گمراہی کا سامان کیا۔اس نظام زیست کو اسلام سے کوئی علاقہ نہیں اس لیے کہ رہبانیت فطرت سے بغاوت ہے حقیقت سے فرار ہے۔فرائض سے کوتاہی ہے۔اعمال میں تساہل ہے جس کی وجہ سے اسلام نے رہبانیت کی مخالفت کی۔جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو عربوں میں موجود عیسائی رہبانیت کی طرف مائل تھے اور اسے نیکیوں کا درجہ کمال جانتے تھے۔

رہبانیت سے مراد ترک دنیا ہے ترک لذات ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ خاندانی اور سماجی نظام کی نفی ہے،راہب عورت کے قریب نہیں آتے جس سے اُن کی نسل منقطع ہو جاتی ہے۔وہ شہروں اور آبادیوں سے دور ویرانوں جنگلوں اور غاروں میں اللہ کی عبادت کرتے اور ہر دم خود کو اسی امر میں مشغول رکھنے کی کوشش کرتے۔بعض راہب اور نتیں (جو عورتیں رہبانیت اختیار کریں) گرجوں میں اکٹھے ہی گوشہ نشین ہو جاتے اور بظاہر تجرد کی زندگی گزارتے۔لیکن یہ طرز زندگی چونکہ قانون فطرت کے خلاف تھا اس لیے اُن کے اندر شرمناک اخلاقی برائیاں جنم لے لیتی تھیں۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جہاں زہد وقناعت کو اعلیٰ درجے کی اخلاقی صفت قرار دیا ہے وہاں رہبانیت کو سخت

ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور صحابہ کو رہبانیت سے اجتناب برتنے کی تلقین فرمائی ہے۔ زہدو قناعت تو یہ ہے کہ انسان دنیا میں رہ کر دنیا کی لذتوں میں اس قدر نہ کھو جائے کہ آخرت اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے چنانچہ زہد گناہوں سے بچنے اور سادہ زندگی گزانے کا نام ہے اور قناعت یہ ہے کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اُس کا شکرادا کیا جائے اور جو کچھ اُس نے اپنی کسی مصلحت کی بنا پہ روک لیا ہے اُس کا شکوہ نہ کیا جائے۔ اوپر پیش کی گئی روایات میں بھی راہبانیت سے رُک جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اِن ارشادات کے بعد بھی اگر کوئی شخص دستور طریقت کی پیروی اختیار کرنے پہ بضد ہے تو اسلام میں کوئی جبر نہیں کہ خالق نے لوگوں کو ارادے کی آزادی اور اختیار سے نواز ہے کہ وہ خیر اور شر کی جس راہ پہ جانا چاہے اُس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں یہ الگ بات ہے کہ خالق کی اطاعت میں خیر ہے اور دنیاوی اور آخروی کامیابی ہے اور نفس کی پکار میں اس دنیا کی ذلت ہے اور جہنم کا کڑا عذاب ہے۔

اب ہم کچھ نظر دستور طریقت پہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ آخر اس کے نظریات ہیں کیا؟

دین طریقت کے آفاقی مذہب ہونے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے تو وہ اس لحاظ سے نہیں کہ اس میں عالمگیریت اور ہمہ گیریت پائی جاتی ہے اور جملہ بنی نوع انسان کو پیش آمدہ مسائل کے حل کرنے کا ضامن ہے بلکہ یہ دعویٰ اس لحاظ سے ہے کہ یہ دین زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے اور دنیا کے تمام مذاہب میں موجود رہا ہے۔ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دین طریقت کے پیروکاروں کو سینٹ کہتے تھے۔ قرآن نے اِن کو راہبان کہا ہے۔ ہندوؤں میں دین طریقت کے پیروکاروں کے کئی نام ہیں۔ اور لوگ انھیں مختلف اشکال کی وجہ سے مختلف نام دیتے رہے ہیں چنانچہ ایسے لوگ جوگی، گرو، سادھو رِشی، مُنی جیسے ناموں سے موسوم کیے جاتے ہیں۔

بدھ مت میں ایسے لوگوں کو بھکشو کہا جاتا ہے، سکھ انھیں گیانی کہتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں ایسے لوگوں کے بے شمار نام ہیں جن سے لوگ آشنا ہیں مگر بدقسمتی سے اُن کی حقیقت سے آشنا نہیں چنانچہ ایسے لوگوں کو ہمارے ہاں پیر، فقیر، مرشد، درویش صوفی، خدا رسیدہ، عارف، مجذوب، واصل باللہ

واصل بحق، قطب، ابدال، غوث کہا جاتا ہے۔ اِن میں کوئی بادشاہ ہے تو کوئی وزیر کوئی چپڑاسی ہے تو کوئی سپاہی یعنی اِن کے یہ نام اِن کے مختلف درجات کو ظاہر کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو برملا فرمادیا تھا کسی عجمی کو کسی عربی پہ کسی عربی کو کسی عجمی پہ کسی گورے کو کسی کالے پہ کوئی برتری حاصل نہیں اگر اللہ کے نزدیک کوئی برتر ہے وہ تقویٰ کی بنیاد پہ برتر ہے۔ دستورِ طریقت میں بنیادی امر ذاتی مکاشفات و مشاہدات ہیں، لیکن اِن مشاہدات اور مکاشفات میں فروعی اختلاف کے باوجود چند باتیں ایسی ہیں جن پہ اِن سب مذاہب کا اتفاق ہے۔ ایسی ہی متفقہ باتوں کو دین طریقت میں نظریات وعقائد کی حیثیت حاصل ہے۔ اُن میں سب سے پہلا نقطے کو وحدت الوجود کہا جاتا ہے یعنی انسان چلہ کشی اور ریاضتوں کے ذریعہ اس مقام پہ پہنچ جاتا ہے کہ اُسے کائنات کی ہر چیز میں خدا نظر آنے لگتا ہے۔ بلکہ وہ ہر چیز کو خدا کی ذات کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس قدرِ مشترک کے لحاظ سے ایک بدکار انسان، ایک نیک بزرگ، ایک درخت، ایک کار، ایک بچھو، ایک باغ، ایک دریا، ایک ستارہ، ایک سائیکل، ایک طوائف، گندگی کے ایک ڈھیر، غرض ہر جگہ اس شخص کو خدا ہی نظر آتا ہے کہ یہی وحدت الوجود کی بنیاد ہے۔

اس کے بعد جب انسان مزید چلہ کشی کرتا ہے، مزید ریاضتیں کرتا ہے، خود کو مزید ذلیل کرتا ہے، اور اُس کے جسم میں کیڑے پڑ جاتے ہیں اُس کے کپڑوں کی بدبو دور تک جاتی ہے اور اُس کے گلے میں پڑے ہوئے منکے تک سیاہ ہو جاتے ہیں تب وہ وحدت الشہود کے منصب پہ فائز ہو جاتا ہے۔ اور وحدت الشہود کیا ہے؟ وحدت الشہود یہ ہے کہ انسان جب وحدت الوجود کی حالت میں ایک وقت گزار لیتا ہے تو اس کی ہستی خدا کی ہستی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ گویا خدا کی حیثیت ختم ہوئی اور وہ خود ہی خدا بن گیا۔ اگرچہ یہ نظریہ خدا کی ہستی کو کائنات سے الگ تو تسلیم کرتا ہے اور اس کائنات کو خدا کا پرتو یا سایہ تصور کرتا ہے مگر جب وہ وحدت الشہود کی منزل کو عبور کر لیتا ہے تو اس روحانی ترقی کی بنا پہ انسان خود کو خدا کی ذات میں مدغم کر دیتا ہے۔ اس سے اگلا مقام یہ ہے کہ انسان اپنے آئینۂ دل کو اتنا صاف اور لطیف بنا لیتا ہے کہ خدا کی ذات خود اس کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے یا حلول کر جاتی ہے

اوراس روحانی رتبے کو دینِ طریقت میں حلول کہا جاتا ہے۔ گویا وحدت الشہود میں تو خیر انسان روحانی ترقی کرتا کرتا خدا کی ذات میں گم ہو جاتا ہے مگر حلول کی صورت میں خدا خود اپنے مرتبے سے نیچے اتر کر انسان کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ (استغفراللہ)

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ دستورِ طریقت کے صرف اِن تین نکات پہ ہی غور کریں اور دیکھیں کہ اسلام سے اِن نظریات و عقائد کا کیا تعلق ہے تو اس کا صاف اور سیدھا جواب یہی ہوگا کہ اِن غیر معقول اور جاہلی نظریات و عقائد کا اسلام سے کیا تعلق۔ اور اس سے قبل نظریہ حلول قوم بنی اسرائیل میں رائج تھا جس کی مذمت میں قرآن اترتا رہا۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ!

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ توبہ 31/9)

ترجمہ؛

"اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ اُن کے منہ کی باتیں ہیں پہلے بھی کافر اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے"۔

✡✡✡✡✡✡

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حلول کا عقیدہ جسے بعض کم عقل مسلمانوں نے اختیار کرلیا ہے وہ تو

یہود ونصاریٰ سے بھی پہلے اس دنیا میں موجود تھا۔تاہم قرآن نے لوگوں کو بتایا کہ حلول کا عقیدہ ایک باطل عقیدہ ہے اور لوگوں کے منہ کی بات ہے اور لوگ ہمیشہ سے اس طرح کی باتیں کرتے آئے ہیں اور خدا نے قرآن حکیم میں فرما دیا ہے کہ جس نے مریم کے بیٹے مسیح کو خدا کہا اُس نے کفر کیا۔کیونکہ عیسائی کہتے کہ خدا کی ذات حضرت عیسی میں حلول کر گئی ہے۔جس کی طرف قرآن حکیم میں بھی اشارہ کیا گیا۔

ارشاد ہوا کہ!

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 72/5)

ترجمہ؛

بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مریم کے بیٹے مسیح خدا ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

یہود و نصاریٰ تو راہبانیت کی پستی میں جا کر دین کی اساس کو بالکل ہی بھلا بیٹھے تھے جیسا کہ مسلمانوں کے ایک طبقے نے کیا ہے۔چنانچہ یہود ونصاریٰ کے مطابق ضروری نہیں خدا کسی نبی کی ذات میں ہی حلول کرے بلکہ وہ کسی پیر کسی فقیر کسی زاہد کسی عابد بلکہ کسی سازشی شخص یعنی سینٹ پال جیسے شخص کی ذات میں بھی حلول کر سکتا ہے۔(14*) سینٹ پال پہلے یہودی تھا پھر اس نے عیسائیت اختیار کر لی۔اُس نے عیسائیت کو اُس کی بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا۔نظریہ حلول کے بارے میں وہ کہتا ہے۔

”ہم ذاتِ باری میں مسلسل تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔جب ایک شئے دوسری میں مدغم

ہو جائے تو اِن دونوں کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ میں بھی خدا میں تحلیل ہو رہا ہوں اور ذاتِ حق مجھ سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ قسم ہے اس زندہ جاوید خدا کی کہ اب مجھ میں اور خالق کائنات میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ہم دونوں اب ایک ہی ہیں“

✡✡✡✡✡✡

اس عیسائی راہب سینٹ پال کا نقطہ نظر آپ نے ملاحظہ کیا۔ اب ایک مسلمان صوفی کے نقطہ نظر پہ نگاہ ڈالیں۔ صوفی عبدالکریم جیلی (م 820ھ) حلول کے متعلق اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ!

میں نے اپنا وجود کھو دیا، پھر وہ (یعنی اللہ) میری طرف سے مجھ میں قائم مقام ہوا اور یہ عوض جلیل القدر تھا۔ بلکہ بعینہٖ ہی تھا۔ پس میں وہ تھا اور وہ میں تھا، وجود مفرد تھا جس کے لیے کوئی جھگڑنے والا نہ تھا۔ میں اس کے ساتھ اس میں باقی رہا اور ہمارے درمیان سے فرق اٹھ گیا اور میرا حال ماضی و مضارع ایک ہی جیسا ہو گیا لیکن میں نے اپنے نفس کو بلند کیا۔ پھر حجاب اٹھ گیا اور میں اپنی نیند سے بیدار ہو گیا گویا کہ میں لیٹا ہی نہ تھا۔ میں نے اپنی چشم حقیقت سے اپنے آپ کو حق دیکھا“۔

(15*)

✡✡✡✡✡✡

غور فرمایئے! ایک عیسائی راہب اور ایک مسلمان صوفی کے انداز بیان یا انداز فکر میں کچھ بھی فرق نہیں۔ چنانچہ اس سے ہمارا استدلال محکم ہوا کہ تصوف تو دراصل ایک قدیمی تسلسل ہے جس نے اسلام میں بھی راہ بنالی ورنہ اسلام کی تعلیمات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ متاخرین نے مسلمانوں میں

تصوف کی آمد کے بارے میں امت کو اندھیرے میں نہیں رکھا بلکہ تمام تر تفصیلات سے آگاہ فرمایا ہے۔ چنانچہ بیان کیا گیا کہ اسلام کی اولین صدی میں ایک یہودی عالم عبداللہ بن سبا نے اسلام قبول کیا کہ وہ جان چکا تھا کہ اُس کی قوم اب مسلمانوں کا مقابلہ علمی اور عسکری میدانوں میں نہیں کر سکتی چنانچہ اُس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا اور مسلمانوں کی جڑ کاٹنے کا عزم کیا۔ اُس نے درویشی کا لبادہ اوڑھ کر زہد و تقویٰ اختیار کر لیا۔ اور اسی زہد و تقویٰ کی آڑ میں سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک سخت منتظم تھے اس لیے عبداللہ بن سبا احتیاط سے کام لیتا رہا اور زیرِ زمین اپنے مشن کی تیاری میں مشغول رہا۔ وہ اسلامی مرکز سے دور کوفہ بصرہ اور مصر میں اپنی تحریک کو منظم کرتا رہا اُس نے لوگوں کو باور کرایا کہ خلافت تو دراصل حضرت علیؓ کا حق تھی جس پہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ زبردستی قابض ہو گئے تھے۔ وہ مناسب وقت کے انتظار میں رہا اور آخرکار حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حالات اُس کو موافق نظر آئے تو وہ کھل کے سامنے آ گیا اس دوران اُس نے کافی لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔

عبداللہ بن سبا کے ساتھی ہی وہ بدبخت تھے جنھوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا اور بالآخر انھیں شہید کیا۔ اس کے بعد یہی وہ لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہو گئے تھے یہی وہ لوگ تھے جن کی وجہ سے جنگ صفین اور جنگ جمل وقوع پذیر ہوئیں۔ عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گھیر رکھا تھا اور اُن کی خلافت کا نعرہ لگایا تھا۔ اول اول حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن کے تخیل دین سے واقف نہ تھے مگر جب اُن کو احساس ہوا تو انھوں نے اِن لوگوں پہ لعنت کی حتیٰ کہ انھیں قتل بھی کرایا۔ عبداللہ بن سبا ایک عیار درویش کے روپ میں رہتا تھا اُس نے لوگوں کو ظاہری اور باطنی علوم کے بہکاوے میں ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ دین اسلام کا حلیہ بدل کے رکھ دیا اُسی نے اسلام میں سب سے پہلے رموز طریقت اختراع کیے۔ اُس کے ساتھیوں میں اکثریت اُن عراقیوں کی تھی جو نو مسلم تھے اور دین کی تعلیمات سے کما حقہٗ آگاہ نہ تھے اس لیے عبداللہ بن سبا انھیں جو بتاتا

رہا وہ اسے سچ سمجھتے رہے۔ پھر اُس نے لوگوں سے کہا کہ خدا حضرت علیؑ کی ذات میں حلول کر گیا ہے لہٰذا تمھارے لیے اُن کی پوجا کرنا لازم ہے حضرت علیؑ کو اس بارے میں پورا علم نہ تھا کہ اُن کی خلافت کی چھتری کے سائے تلے عبداللہ بن سبا کیا گُل کھلا رہا ہے۔

چنانچہ ایک بار جب عبداللہ بن سبا خود حضرت علی رضی اللہ عنہم سے ملا اور کہا:

اَنْتَ ھُوَ ۔ تو وہی ہے!

تو حضرت علیؑ نے اسے پکڑ لیا کہا:

مجھے تمھارے بارے میں لوگ بتاتے رہتے ہیں اور آج تو میرے منہ پہ ہی جھوٹ اور کفر بک رہا ہے مجھے بتا جو کلمات تو نے کہے اُس سے تیری کیا مراد ہے۔

عبداللہ بن سبا نے کھل کے بات کی۔

جس پہ حضرت علی رضی اللہ عنہم سکتے میں آ گئے اور اُسے شدید سرزنش کی حتیٰ کہ اُسے کہا میری نظروں سے دور ہو جا مبادا کہ میں تجھے قتل کرا دوں۔

عبداللہ بن سبا چلا گیا مگر اب اُس کے چاہنے والے بہت تھے اور اُسے حضرت علی رضی اللہ عنہم کی دھمکیوں کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔

اُس کے جانے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہم کے غلام قنبر نے آپ کو مطلع کیا کہ سر بازار لوگ انھیں خدا کہہ رہے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہم بہت پریشان ہوئے اور انھوں نے کہا اِن لوگوں کو میرے پاس لے آؤ۔

جب وہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہم کے پاس آئے تب بھی اُن کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا حضرت علی رضی اللہ عنہم نے انھیں پیار سے بھی سمجھایا کہ یہ کفر ہے سختی سے بھی سمجھایا کہ یہ کفر ہے مگر وہ لوگ باز نہ آئے۔

اگلے روز پھر یہی ہوا۔ وہ لوگ سر عام حضرت علی رضی اللہ عنہم میں خدائی صفات بیان کر رہے تھے۔ حضرت علیؑ اب کے خود اُن کے پاس تشریف لے گئے اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا واللہ یہ لوگ جو

کچھ کہہ رہے ہیں میں اس سے بری الزمہ ہوں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اِن لوگوں سے کہا اگر تم نے اب یہ کفریہ کلمات کہے تو میں تمھیں آگ میں ڈال دوں گا اور اب کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سنجیدہ تھے کہ وہ دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ یہ اسلام کی بنیادوں پہ براہ راست حملہ ہے اس لیے انھوں نے سخت اقدام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گلے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم پر بہت سے لوگوں کو اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہا تھا۔ حضرت علیؓ نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ اِن لوگوں کو آگ میں جلا دیا جائے حکم کی تعمیل کی گئی اور ستر سے زائد زنادقہ کو آگ میں جلا دیا گیا۔ (16*)

اِن ستر لوگوں کے قتل سے فتنہ اور بھی بھڑک اٹھا اور باقی رہ جانے والے زنادقہ نے کہا!

لَایُعَذِبُ بِالنَّارِ اَلَّارَبُّ النَّارِ ۔

انھوں نے ھمیں آگ میں جلایا اور آگ کا عذاب تو اللہ ھی دیتا ھے۔

چنانچہ یہ فتنہ مٹ نہ سکا اور اس نے اپنے ارتقاء کا سفر جاری رکھا۔ مختلف زمانوں میں لوگ انھیں مختلف ناموں سے پکارتے رہے۔ کبھی اِن کو نصیریہ کہا گیا، کبھی یہ کیسانیہ بنے، اس کے بعد انھیں قرامطیہ کہا گیا۔ باطنیہ بھی یہی لوگ ہیں اور ملامتیہ بھی انھی میں سے ہیں۔ آج کے عہد میں انھیں صوفی یا اہل طریقت کہا جاتا ہے۔ شیخ اکبر المعروف ابن عربی (م 638ھ) اور حسین بن منصور حلاج (م 309ھ) کا تعلق اسی سلسلہ سے تھا۔

علامہ سیّد سلیمان ندوی کا ایک رسالہ " **معارف** "میری نظروں سے گزرا جس میں انھوں نے حسین بن منصور حلاج کے متعلق ایک بصیرت افروز مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے حسین بن منصور حلاج کو اعلیٰ درجے کا شعبدہ باز قرار دیا ہے۔ وہ ایران میں ایک پارسی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا آبائی وطن بیضا تھا وہ باسط نامی ایک بستی میں رہتا تھا جو بصرہ اور کوفہ کے درمیان تھی۔ اُس نے خدائی کا دعویٰ کیا تو وقت کے علماء نے اسے کافر قرار دے دیا۔ یہ خلیفہ المقتدر باللہ کا دور تھا۔ حسین بن منصور حلاج لوگوں کو ورغلاتا رہتا اور انھیں دین حق سے برگشتہ کرتا رہتا۔ صالح مسلمانوں نے کئی بار

خلیفہ کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی اور خلیفہ نے بھی کئی بار اسے بلا کے کہا کہ چونکہ وہ کافر قرار دیا جا چکا ہے اس لیے ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں تاہم اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔ مگر حسین بن منصور حلاج اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ اُس کا عقیدہ کیا تھا اُس کے شعروں سے ظاہر ہے تاریخ بغداد سے اُس کے کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں جس میں برملا وہ اپنے کفر کا اظہار کرتا ہے اور دین اسلام اور عقیدہ توحید کی نفی کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ خلیفہ کے حکم پہ بلآخر اسے قتل کر دیا گیا۔

عَقَدَ الْخَلَائِقُ فِیْ الْاِلٰہِ عَقَائِدٌ
وَ اَنَا اعْتَقَدْتُ جَمِیْعَ مَا اعْتَقَدُوْا

اللہ کے بارے میں لوگوں میں بہت سے عقیدے ہیں اور میں اِن سب عقیدوں سے الگ عقیدہ رکھتا ہوں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁

کَفَرْتُ بِدِیْنَ اللّٰہِ وَالْکُفْرُ وَاجِبٌ
لَدَیَّ وَ عِنْدَالْمُسْلِمِیْنَ قَبِیْحٌ

میں اللہ کے دین سے کفر کرتا ہوں اور یہ کفر میرے لیے واجب ہے، جب کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے یہ واجب نہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁

سُبْحَانَ مَنْ اَظْہَرَنَا سُوْتَہٗ
سِرًّا سَنَا لَاھُوْتِہِ الْمُثَاقِبٌ

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے ناسوت (یعنی حسین بن منصور حلاج) کو اپنے لاہوتِ ثاقب کی چمک کا رازدار بنایا۔

✿✿✿✿✿✿✿✿

ثُمَّ بَدَا فِیْ خَلْقِہٖ ظَاھِرًا
فِیْ صُوْرَۃِ الْاٰکِلِ وَالشَّارِبِ

پھر وہ اپنی مخلوق میں ایک کھانے اور پینے والے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

✿✿✿✿✿✿✿✿

حَتّٰی لَقَدْ عَا یَنَہٗ خَلْقَہٗ
کَلَحْظَۃِ الْحَاجِبِ بِالْحَاجِبِ

یہاں تک کہ اس کی مخلوق نے اِس کو اس طرح دیکھا جس طرح ایک دیکھنے والا دوسرے کو دیکھتا ہے۔(17*)

✿✿✿✿✿✿✿✿

علم کے صوفیانہ تصور پہ جس قدر روشنی ہم ڈالنا چاہتے تھے اُس میں کامیاب نہیں ہوئے۔اس لیے کہ

یہ موضوع اپنی وسعت کے اعتبار سے الگ سے ایک کتاب کا متقاضی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جس قدر لکھا اس سے بھی ایک بات تو بہر حال کھل کے ظاہر ہو جاتی ہے کہ دین طریقت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔چاہے کوئی کتنی ہی کھینچا تانی کرے اسلام سے دستور طریقت کو ثابت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ دین طریقت کو الگ سے ایک مذہب تو کہا جا سکتا ہے مگر اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ دستور طریقت کا سارا نظم اسلام کے خلاف ہے، اسلام کی ضد ہے، قرآن کی ضد ہے، رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے انکار ہے۔اس لیے کہ یہ تو ایک سازش تھی جو بدقستی سے قائم رہی اور مسلمان بہت سے اجنبی تخیلات کی طرف متوجہ ہو گئے۔تاہم اللہ کا شکر ہے کہ پاک و ہند کے سوا دنیا کے بیشتر مسلم ممالک اس لعنت سے پاک ہیں اور دین کے اصل تصور سے آگاہ ہیں ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ایسے خطے کے باسی ہیں جہاں دین طریقت کے ماننے والے بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اسی لیے تو ہماری مسجدیں ویران قبریں پر رونق ہیں۔لوگوں نے مزاروں پہ لاکھوں روپے لگائے ہیں اور کروڑوں روپے کما رہے ہیں۔عوام جاہل ہے اور علماء کا بڑا طبقہ قبر پرستی کو جائز قرار دیتا ہے جس کی وجہ سے دین توحید پس منظر میں چلا گیا ہے تاہم اب ہمارے بچے پڑھ لکھ گئے ہیں اس لیے اس تاریک رات کا سحر کسی حد تک ٹوٹنے کو ہے۔تاہم ابھی اس سلسلے میں کافی کام کی ضرورت ہے کیونکہ عقیدہ تو بنیاد ہے جب عقیدہ ہی غلط ہوگا تو عمارت یقینی طور پہ ٹیڑھی ہی بنے گی۔

نظام طریقت کے چل نکلنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں اس بدتاثر کو پھیلا دیا گیا ہے کہ وہ روز محشر کی فکر نہ کریں پیر صاحب اُس روز اُن کا بازو تھام کے انھیں جنت میں لے جائیں گے، نماز کی کوئی ضرورت نہیں بس پیر صاحب کے آستانے پہ حاضری ضروری ہے، حج کی کوئی ضرورت نہیں بڑے پیر صاحب کی قبر پہ جانے سے حج کا ثواب مل جاتا ہے، زکواۃ دینے کی کوئی ضرورت نہیں آستانے پہ چڑھاوا ہی کافی ہے روزہ رکھنے بھی کوئی ضرورت نہیں اس لیے کہ پیر صاحب بھی روزہ نہیں رکھتے۔مگر جب تم روزہ نہ رکھو تو فدیہ پیر صاحب کو پہنچا دینا۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عام آدمی جو اپنے کاروبار میں مصروف ہے جس کو دولت کمانے سے ہی فرصت نہیں۔وہ ایک دو ماہ میں ایک بار پیر صاحب کے

حاضری لگوا آتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اُس نے دین کو حاصل کرلیا ہے۔ پیر صاحب کے دربار پہ چڑھاوا چڑھا کے وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے انفاق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس سارے سلسلے میں انسان اپنا ہی فائدہ دیکھتا ہے اور پیر صاحب کا ممنون ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے نماز جیسی مشکل اور تکلیف دہ عبادت سے بچا لیا ہے کیونکہ جب اُس نے چند دن نماز پڑھی تھی تو اکتا گیا تھا ابھی دو گھنٹے بھی نہ گزرتے کہ پھر سے نماز کا وقت آ جاتا۔ دین طریقت نے انسانی نفس کی کمزوریوں کو سمجھا اور اُس کو عمل سے آزاد کر دیا اُسے غیر مرئی قوتوں کا یقین دلایا اور انسان سے خاص طور پہ مسلمان سے نہ صرف اُس کی مہلت عمل کو چھین لیا بلکہ اُس کے ایمان تک کو ختم کر دیا کہ اسلام تو دین توحید ہے جب پیر ہی خدا بن بیٹھا تو کہاں کی توحید اور کہاں کا اسلام؟ چنانچہ یہ وہ نظریہ علم ہے جو اگرچہ قدیمی ہے اس کے باوجود اس سے کسی علمی پہلو کی خوشبو نہیں آتی اہل تصوف نے انسان اور کائنات کے باہمی ربط پہ کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا۔ اس لیے کہ دراصل تصوف کا نظم کبھی بھی کسی علمی راہ پہ نہیں چلا بلکہ اِن کا سارا اثاثہ تو زبانی ہے کہ میرے دادا نے فلاں پیر صاحب کو ہوا میں اڑتے دیکھا تھا چنانچہ اس پیر صاحب کی پوجا ضروری ہے۔ اب اسلام میں تو رسول اللہ ﷺ کی پوجا کو بھی شرک کہا گیا ہے تو یہ لوگ پیر صاحب کی پوجا کو کیسے راضی ہو جاتے ہیں اس کا سیدھا اور صاف جواب یہی ہے کہ قرآن میں انسان کی ایک قسم کو جانوروں سے بھی گیا گزرا بتایا ہے۔ شاید یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کا عکس اپنے جیسے بندے ہی میں تلاش کرتے ہیں۔ پس دین طریقت طریق جاہلیت ہے اور اس پہ یقین کرنا اسلام سے انکار کرنا ہے۔

دین طریقت اسلام نہیں بلکہ اسلام سے الگ ایک دین ہے جسے لوگوں نے اپنی خواہش نفس کی بنا پہ اپنا لیا ہے۔ اللہ ہمیں ہدایت دے کہ وہی تو ہے جو ہدایت دیتا ہے، وہی تو ہے جو بیٹے دیتا ہے، وہی تو ہے جو رزق دیتا ہے وہی تو ہے جو خوشی دیتا ہے، وہی تو ہے جو غم دیتا ہے، وہی تو ہے جو حاجت روا ہے، وہی تو ہے جو سنتا ہے، وہی تو ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے، وہی تو ہے جو علم دیتا ہے، وہی تو ہے جو عقل دیتا ہے، وہی تو ہے جو رہنمائی کرتا ہے، وہی تو ہے جو مالک کائنات ہے، وہی تو ہے جو ہر چیز پر

قابض ہے، وہی تو ہے جس کا حکم چلتا ہے زمینوں پہ اور آسمانوں پہ، وہی تو ہے جس نے انسان کی راہنمائی کے لیے قرآن اتارا، وہی تو ہے جس کے حکم سے ہوائیں بادلوں کو لیے ہوئی چلتی ہیں، وہی تو ہے جس کے حکم سے علم ورزق بانٹا جاتا ہے، وہی تو ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے وہی تو ہے جس کے حکم سے دن رات کا تسلسل قائم ہے، وہی تو ہے جس کے حکم سے روحیں قبض کی جاتی ہیں وہی تو ہے جس سے انعام کی توقع ہے، وہی تو ہے جس کی رحمت اُس کے غضب پہ غلبہ پانے والی ہے وہی تو ہے جس سے بھلائی کی امید ہے، وہی تو ہے جس کے حکم سے ہمیں کامیابی کا پروانہ تھمایا جائے گا، وہی تو ہے جو سراپا نور ہے، وہی تو ہے جس کے دم سے حسن کائنات میں رونق ہے، وہی تو ہے جس کے حکم سے زمان ومکان لرز جاتے ہیں، وہی تو ہے جس نے شیطان کو مردود قرار دیا، وہی تو ہے جس کے حکم سے زمین وآسمان لپیٹ دیئے جائیں گے۔۔۔اور تیرے پیر کے پاس کیا ہے؟
کچھ بھی تو نہیں؟؟؟

✡ ✡ ✡

علم کا جاہلی تصور

علم کا ہر وہ تصور جاہلی ہے جس میں خالق سے بے اعتنائی اختیار کی جائے اور اُس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ راہنمائی کا کوئی اہتمام نہ کیا جائے۔ چنانچہ آج کے نظام علم خاص طور پہ علم کے جاہلی تخیلات ہیں جن کی بنیاد (Rationaism) عقلیت پہ رکھی ہے۔ دورِ جدید کے فلسفہ علم کی بنیاد (Reason) یعنی عقل اور (Experiment) یعنی تجربے پہ رکھی ہے۔ عقلیت پسندی انسان کا قدیمی تخیل علم ہے۔ ہر دور میں لوگوں کے ایک گروہ نے عقل کو لامحدود قرار دیا ہے اور اسی کے ذریعے حیات اور کائنات کے عقدے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فلسفہ اور سائنس جس کی بنیاد عقلیت پہ رکھی ہے اپنی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں انسان کی رہنمائی میں ناکام رہی ہے اور اُس نے حیات و کائنات کی جو تشریحات بھی کی ہیں اُس سے یہ مسئلہ سلجھنے کی بجائے الجھ کے رہ گیا ہے۔ بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ دورِ جدید کے فلاسفہ نے علم کے جو بہت سے چراغ روشن کیے ہیں وہ انسان کی راہنمائی کے لیے کافی ہیں اور انسان کو کسی الہامی علم کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک فکری مغالطہ ہے جس نے مغرب کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ مغرب کے نظام ہائے فکر و فلسفہ

کی بنیاد عقل ہے اور وہ علم کا معیار وحی یا کسی منصب (Authortiy) کے ساتھ منسلک کرنے کو تیار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کو بس عقل کافی ہے حالانکہ ابھی تک وہ یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکا کہ علم کے نظامِ عقلیت کے ماخذ کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں مغرب کے اہل فلسفہ باہم متفق نہیں۔ اس ضمن میں جو مختلف آراء سامنے آئی ہیں اُن کے مطابق۔۔۔

۱۔ علم محض حواس یا تجربے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کی کوئی عقلی یا فکری بنیاد موجود ہو۔ وہی شے حقیقت رکھتی ہے جس کی بنیاد ذہن انسانی میں موجود ہو۔

✡✡✡✡✡✡

۲۔ دنیا میں کوئی حقیقت پیدائشی نہیں ہوتی۔ تمام علم یا تو حواس سے حاصل ہوتا ہے یا پھر تجربے سے، چنانچہ جنھیں ہم علم کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں وہ کچھ ایسے لازم بھی نہیں بلکہ انھیں زیادہ سے زیادہ امکانی علم ہی کا ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

۳۔ دنیا میں دو طرح کے اجسام پائے جاتے ہیں ایک قدرتی اور دوسرے مصنوعی۔ علم اِن دونوں کے مابین تعلق اور توافق کو اجاگر کرتا ہے۔ اور فلسفہ اِن اجسام کی حرکات کے مطالعہ کا نام ہے۔

✡✡✡✡✡✡

جدید علم فلسفہ کی بنیادیں فرانسس بیکن (1626 - 1561ء)، تھامس ہابز

(1679 - 1588ء)اور ڈیکارٹ (1650 - 1596ء) نے فراہم کیں۔اِن کو لوگوں کے تخیل علم کو سراسر مادی تخیل علم قرار دیا جا سکتا ہے۔اِن کے ہاں کسی خالق کا کوئی تصور موجود نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ عقل کی لامحدودیت کے قائل ہیں۔اِن لوگوں کے علمی تخیل نے مغرب کو خدا سے لاتعلق اور مذہب سے دور کر دیا۔اس فلسفہ علم کے تحت جو معاشرے معرض وجود میں آئے وہ بظاہر مطمئن اور آسودہ نظر آتے ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔اِن لوگوں کی زندگی میں چمکتے رنگ ایک دھوکا ہیں جو وہ باقی دنیا کو دینا چاہتے ہیں۔

ایک مثال سے سمجھیں کہ اُن کی زندگی کے اصل حقائق کیا ہے۔میرا ایک دوست پچھلے دِنوں امریکہ سے آیا اور وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اندرون ملک ایک پرواز کے دوران اُس نے دیکھا کہ اُس کی ساتھ والی سیٹ پہ ایک بوڑھا امریکی بیٹھا ہوا تھا۔وہ بے تحاشا شراب پی رہا تھا۔ ہر پانچ منٹ بعد وہ میزبان کو طلب کرتا اور اُس سے شراب حاصل کر لیتا۔ ہر پندرہ بیس منٹ بعد وہ غسل خانے میں جاتا اور پھر ہانپتا لڑھکتا واپس آ جاتا۔مگر اُس کے شراب پینے کے تسلسل میں کوئی کمی نہ آئی حتیٰ کہ اُس نے سیٹوں کے بیچ میں ہی قے کر دی۔ جہاز کا عملہ صفائی کے لیے آیا انھوں نے اُس بوڑھے کو اٹھایا اور پچھلی سیٹوں پہ منتقل کر دیا۔ جہاز کے میزبان نے میرے استفار پہ بتایا کہ انھیں اس طرح کے کئی کیسوں سے نمٹنا پڑتا ہے۔یہ دراصل ایک ہوس ہے جو اس جیسے بوڑھوں کو اس طرح کی نامعقول حرکتوں پہ اکساتی ہے۔اُس میزبان نے مجھے اس بابت تفصیلات فراہم کرتے ہوئے بتایا کہ اس طرح کے بوڑھے اولڈ ہومز میں رہتے ہیں جہاں اگرچہ شراب موجود ہوتی ہے مگر وہ عام سی شراب ہوتی ہے جس سے یہ لوگ سیر نہیں ہوتے۔اندرون ملک سفر کے لیے ہماری کمپنی رعایتی نرخوں پہ ٹکٹ جاری کرتی ہے اِن لوگوں کو گورنمنٹ کی طرف سے جو پیسے ملتے ہیں وہ انھیں اس طرح کی عیاشیوں میں خرچ کرتے ہیں۔اس بوڑھے ہی کو لے لیں جس شہر کو یہ جہاز جا رہا ہے وہاں سے اسے کوئی کام نہیں۔یہ محض عمدہ اور اعلیٰ شراب کے حصول کے لیے ہمارے ساتھ سفر کر رہا ہے۔واپسی پہ بھی یہ اسی طرح شراب مانگے گا اور غسلخانے میں جا کر قے کرے گا اور پھر شراب مانگے گا۔پھر

جہاز کے اندر ہی قے کرے گا اور جب ہم منزل پہ پہنچیں گے تو سے اٹھا کر نیچے لے جایا جائے گا۔

اب اگر کوئی کہے کہ یہ جدید علم ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان چمکتے دھمکتے اور چنگاڑتے ہوئے خوبصورت جہازوں میں بیٹھ کر ہوا میں اڑتا ہے اور انتہائی تیز رفتاری سے سفر کرتا ہے۔ تو اُس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس جدید سائنس نے اگر جہاز بنالیا تو پھر وہ انسانوں کو اس کے اندر بیٹھنے کی درست تعلیم کیوں نہ فراہم کر سکا۔ یہیں سے اُس اخلاقی علم کی ضرورت کا احساس شروع ہوتا ہے جس میں شرفِ انسانی کے مدارج اور رویے طے کیے جاتے ہیں۔ عقلیت پسند معاشروں نے اگرچہ اخلاقی ضوابط وضع کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اُن کی کوتاہی یہ ہے کہ انھوں نے انسان سے کسی مقتدر طاقت کے سامنے جوابدہی کے تصور کو چھین لیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کو اس بات کی کوئی پرواہ نہ رہی کہ وہ انسان کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے یا جانور کی طرح۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا اب ہم اُن علمی بنیادوں پہ کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جن کے منطقی نتائج کے طور پہ مغرب کا انسان خود کو جانور سے ممتاز نہیں کر پایا۔ کہ خالق کے شعور کے بغیر انسان جانور ہی تو ہے؟؟؟

☜ تھامس ہابز کا نظریہ علم یہ ہے کہ فلسفہ علت سے معلول اور معلول سے سبب اخذ کرنے کا نام ہے یعنی ہم حواس یا تجربے سے حاصل ہونے والے علم سے اصول زیست دریافت کر سکتے ہیں۔ یا جو بات اس سے پہلے انسانی تجربے میں آ چکی ہو اس سے استدلال ممکن ہے۔ ہابز کے نزدیک حقیقی سائنس یہی ہے کہ سوچ کا عمل درست اصولوں سے شروع ہو۔ اب فلسفہ کے سامنے یہ سوال کھڑا تھا کہ کس عمل کو پہلا اصول قرار دیا جائے اس کے بعد ہی اس کی علت اور معلول کی طرف جایا جا سکتا ہے چنانچہ ہابز نے حرکت کو پہلا اصول قرار دیا اور کائنات کے مادی اجسام کی حرکات کے مطالعے کو علم فلسفہ کی بنیاد قرار دیا۔

☜ فرانسس بیکن کے نزدیک عقل اور مشاہدہ علم کی بنیاد ہیں۔ انسانی عقل ہی ہے جو اشیا کی

ماہیت کو متعین کرتی ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ دیکارٹ نے وجودیت پہ زور دیا اور کہا کہ سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ میں ہوں چونکہ میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں۔ اُس کے نزدیک کائنات کے تمام اصول علم ریاضی سے دریافت کیے جاسکتے ہیں کیونکہ کائنات ریاضیاتی اصولوں کے ماتحت ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ سپینوزا کے نزدیک عقل اور وجدان علم کا ماخذ ہیں اور الہامی علوم علم کی اعلیٰ ترین شکل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ غلطی علم کی کمی کا نام ہے۔ ایک تصور کبھی غلط یا صحیح نہیں ہوتا جو بات اس کو صحیح یا غلط بناتی ہے وہ ایک ایسے وجود کا فرض کرنا ہے جو دراحقیقت موجود ہی نہیں۔

✡✡✡✡✡✡

اٹھارویں صدی عیسوی کے اہل دانش کے ہاں بھی حیات و کائنات پہ تفکر کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ جان برکلے (1753 - 1685ء)، جان لاک (1632-1706ء) اور ڈیوڈ ہیوم (1776- 1711ء) کا نظریہ کائنات ملتا جلتا ہی تھا کہ اِن کے نزدیک انسانی ذہن سے خارج کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے انسان کے ذہن ہی میں ہے۔ تاہم یہ امر خوش آئند ہے کہ اِن فلاسفہ نے انسان کو جانور سے بہرحال ممتاز قرار دیا اور اسے کائنات کی

سب سے اہم مخلوق قرار دیا۔جیکو روس (1712-1778ء) نے البتہ کہا کہ انسان کوئی مشین نہیں ہے بلکہ انسان احساسات اور جذبات سے لبریز ایک وجود ہے جسے زبردستی سائنس اور ثقافت کی زنجیروں سے باندھا جا رہا ہے۔اور آلات سے اس کے احساسات کو کچلا جا رہا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ عمانویل کانٹ (1724-1804ء) نے سابقہ نظریاتِ علم کا ابطال کیا۔جرمنی کے کانٹ کو مغربی فلاسفہ میں عہد جدید کا ارسطو کہا جاتا ہے۔اس عظیم فلسفی نے انسان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ مشینیت سے ہٹ کر انسان کا ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔انسان کے اندر سے ابھرنے والی آوازوں کا مطالعہ کرنے سے انسان کائنات کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے اور انسان کا دل اس بات کا گواہ ہے کہ وہ کسی خالق کے در پہ جھکنا چاہتا ہے۔چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات خدا نے بنائی ہے اور اسی نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ شوپنہائر (1787-1860ء) کا تعلق بھی جرمنی سے تھا مگر اُس کا فلسفہ مادیت کے گرد ہی گھومتا ہے اُس نے انسانی خواہشات کی تکمیل کو ہی مقصد کائنات قرار دیا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ فریڈرک نطشے (1844-1900ء) کا تعلق بھی جرمنی سے ہے تاہم اُس نے جو علمی نظریہ پیش کیا اُسے بھی قابل قدر قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔اُس نے کہا کہ کائنات میں

طاقت کا اصول غالب ہے طاقتور کمزور کو کھا جاتا ہے اور یہ کائنات یونہی چلتی رہے گی اور ایک روز ختم ہو جائے گی۔ انسان کو چاہیے کہ وہ طاقت حاصل کرے تا کہ دوسروں پہ غلبہ پا سکے۔

☜ اگسٹ کومٹ (1798-1857ء) کا نقطہ نظر قدرے علمی ہے وہ کہتا ہے کہ کائنات مشاہدے اور تجربے کی دنیا ہے۔ جس کی بدولت ہمیں مختلف چیزوں کا باہمی ربط نظر آتا ہے۔ اور انسان اپنی عقل سے زندگی کے لیے قاعدے اور قانون وضع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ جان سٹوارٹ مل (1806- 1883ء) نے اسی نقطہ نظر کی توسیع کی جسے اگسٹ کومٹ نے پیش کیا تھا۔ اُس نے کہا کہ کائنات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نظم انتہائی مربوط ہے اس لیے انسان کو کائنات کے اس نظم سے اصول زیست اخذ چاہییں اور اپنی زندگی کو بھی اسی طرح مربوط بنانا چاہیے جس طرح کہ کائنات کا نظم مربوط ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ ہربرٹ سپنسر (1820-1903ء) نے کہا کہ انسان اس ارتقائی عمل کا حصہ ہے جو اس کائنات میں پایا جاتا ہے۔ ارتقاء یعنی تبدیلی کا قانون ہی اس دنیا کا بنیادی قانون ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ ولیم جیمز (1842-1910ء) بھی عقلیت پسند ہے اور تجربہ اور مشاہدہ کی دنیا کا قائل ہے البتہ اس نے انسان کو کائنات کی سب سے ارفع مخلوق قرار دیا ہے اور کہا کہ کائنات کو انسان ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ برٹرنڈ رسل (1872-1970ء) کے نزدیک دنیا ایک عظیم حسابی مشین ہے جو سائنس کے کلیات پہ چل رہی ہے جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی انسان اس نظام کا حقیر سا پرزہ ہے۔ اس عظیم مشین کا بھاری چکر چل رہا ہے اس کے اندر جو بھی آتا ہے وہ پس جاتا ہے ۔انسان بھی اس کے اندر پس رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

✡✡✡✡✡✡

یہ چند حوالے اہل مغرب کی اس سوچ کو واضح کرتے ہیں کہ انھوں نے علم کے مسئلے کے بارے کس طرح سوچا اور وہ اشیاء کی ماہیت تک رسائی کے بارے میں کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اس سے ایک واضح نتیجہ تو یہ نکل کے سامنے آتا ہے کہ مغرب کا فلسفی کائنات کے ہر مسئلے کو عقل کی بنیاد پہ ہی حل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری بات جو اُن کے اس علمی طرزِ عمل سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہر مسئلے کو خالق کے کسی بھی تصور کے بغیر حل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اسی تصور کی بنیاد پہ وہ زندگی گزارنے کے فلسفے کو استوار کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے تصورِ زِیست کی جو صورت گری کی اُس میں کسی خالق کے وجود کی گنجائش نہ چھوڑی۔ اس لیے وہ کسی جوابدہی یا انعام و رحمت کے تصور سے بھی خالی رہے۔ ان نظریات کا دائرہ پوری انسانی حیات پہ محیط ہے۔ مذہب کے استثناء کے ساتھ آج تک جو مختلف نظریات انسانی معاشروں میں رائج رہے یا جن نظریات کی بنا پہ معاشرے وجود میں آتے رہے اُن

کی بنیاد عقلیت پہ ہی رکھی ہے۔مثال کے طور پہ دیکھیں کہ مارکس فلسفے کی مادی تعبیر پہ یقین رکھتا ہے۔انسانی تاریخ کو وہ دو گروہوں کی کشمکش کا نام دیتا ہے پھر اس کی بنیاد پہ ایک معاشرے کا تصور پیش کرتا ہے ۔مزید براں ایک تصورِ زیست وہ ہے جس کے رد میں مارکس کیمونزم کا نظامِ حیات مرتب کرتا ہے۔چنانچہ غور سے دیکھا جائے تو قدیم سے لے کر جدید تک تمام معاشروں کی تعمیر میں عقل کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے اور انسانی ارتقاء کی تاریخ کو عقل ہی کا کرشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔اس پورے سلسلہ فکر میں علم کے بنیادی ماخذ حواس اور عقل ہی رہے ہیں۔اور ہمیں جو مختلف علمی نظریات دکھائی دیتے ہیں اُن میں علم کی مختلف تعبیرات کی عقلی کارفرمائی نظر آتی ہے۔فلاسفہ کے جس دور سے ہم بحث کر رہے ہیں اسی دور میں سائنس اور مذہب کے مابین تصادم کے بنیادی تصور نے جنم لیا۔کیونکہ مغرب مذہب کے نام پہ جس حقیقت سے واقف تھا وہ عیسائیت تھی۔کلیسا کا وہ جبر تھا جس نے زندگی کے ہر دائرے کو تنگ کر رکھا تھا۔

اِن فلاسفہ کے کلی نظام میں ردعمل کا وہ زہر محسوس کیا جا سکتا ہے جو کلیسا نے اہل مغرب کی رگوں میں انڈیلا تھا۔تب وہاں کے تمام اجتماعی معاملات پہ چرچ کا قبضہ تھا تب ہر بات کو کلیسا کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور کوئی بھی ایسا علمی نظریہ جس کو بائبل کی پشت پناہی حاصل نہ ہونا قابل معافی گناہ تصور کیا جاتا تھا۔گلیلو کا واقعہ ان نفسیات کو سمجھنے کے لیے کفایت کرتا ہے۔چنانچہ کلیسا جبر کا ایک ایسا نظام تھا کہ اُس سے آزاد ہونے کے بعد اہل مغرب نے صرف کلیسا کو ترک نہیں کیا بلکہ خدا ہی کو ترک کر دیا۔جس کے نتیجے میں علوم کی وہ مادی تشریحات ہمارے سامنے آئیں جنھوں نے مغرب کے اُس معاشرے کی تشکیل کی جس سے خیر وافادیت کے بہت ہی کم پہلو ظاہر ہوئے۔کلیسا جس نظام جبر کا نام تھا اُس کے خلاف نفرت اور بغاوت بالکل فطری تھی۔چنانچہ کلیسا کے لیے اہل مغرب کے دلوں میں جو نفرت پیدا ہوئی اُس نے مذہب کو بحیثیت مجموعی مسترد کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ اُس دور کے فلاسفہ کے علمی نظریات میں تصور کائنات کے جو نظریات وجود میں آئے اُن میں خدا کا کوئی تصور موجود نہ تھا اور یہ ردعمل کی ایک لہر تھی جس سے اگر چہ دنیا گزر گئی مگر جو

اسلوب علم وضع ہوئے وہ برقرار رہے اور اُن کے قبیح اثرات تلے آج کی دنیا سسک رہی ہے۔کلیسا کے خلاف ایک زبردست تحریک بپا ہوئی۔بائبل پہ بے پناہ تنقید کی گئی اور بالعموم لوگوں کے دلوں سے تقدس کے وہ آثار مٹ گئے جن سے وہ کئی صدیوں تک آشنا رہے تھے۔ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے چنانچہ کلیسا کے خلاف زبردست شورش نے مذہب پسندوں کے اندر بھی ردعمل کا شعور اجاگر کیا اور بنیاد پرستی کی اصطلاع وضع ہوئی۔تب ایک طرف مذہب پسند یعنی بنیاد پرست تھے جنھوں نے صدیوں لوگوں کے دلوں پہ حکومت کی تھی مگر جب وہ جبر کی حد سے گزر گئے تو بغاوت ہوئی اور اس بغاوت نے سیکولرازم کو جنم دیا۔مذہب سے بیزار علمی نظریات کو اب عوامی تائید حاصل ہو چکی تھی اس لیے وہ غالب آ گئے اور بنیاد پرست پس منظر میں چلے گئے۔مذہب بیزاری کی یہ تحریک خدا بیزاری کی تحریک بن گئی۔علمی حلقوں نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی کہ مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ مذہب جب اجتماعیت سے نکلتا ہے تو انفرادیت میں بھی برقرار نہیں رہتا اور یہی سب مغرب کے ساتھ ہوا۔

دیکھیں کہ اس کے مقابل قرآن حکیم کے ماننے والوں نے عملاً ایک معاشرت کو وجود بخشا اور قرآنی احکام کی روشنی میں ایک ایسا معاشرہ قائم کر دکھایا جس میں اجتماعیت کا رنگ غالب تھا۔اسلام نے بتایا کہ مذہب جس طرح انفرادی سطح پہ ایک حقیقت ہے اسی طرح اجتماعی سطح پر بھی ایک حقیقت ہے اور یہ کہ مذہب کسی بھی پہلو سے انسان کے فکری وعملی ارتقاء میں مانع نہیں۔اسلام اگر کہیں انسان پہ کوئی قدغن لگاتا بھی ہے تو ذہنی یا فکری نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسان کو کسی ضرر ونقصان سے محفوظ رکھنا ہی ہے۔مغرب میں عیسائیت کے علمبردار ایسی کسی اجتماعیت کو برپا نہ کر سکے جس کا تصور اسلام پیش کرتا ہے۔بلکہ عیسائیت کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوا کہ اس کے سب سے بڑے وکیل پال نے عیسائیت کو اس کی اصل بنیاد سے ہٹا کر ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی جسے اُس نے عیسائیت کا نام دے دیا۔پال کی اس خود ساختہ عیسائیت میں اجتماعی انسانی مسائل کا کوئی ایسا الہامی حل موجود نہ تھا جو انسانی مسائل کا مداوا کرتا اس لیے لوگوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ مذہب

کی بجائے عقلیت کی بنا پہ اپنے مسائل کا حل تلاش کریں اُن کی اس تلاش کو اُس عہد کے فلاسفہ نے آسان کر دیا اور انھوں نے حیات اور کائنات کے ایسے درجنوں حل پیش کیے جن کی مشترک اساس مذہب بیزاری اور خالق کی عدم موجود پہ رکھی تھی یہی علم کا وہ جاہلی تصور تھا جس کا عکس پیش کرنا یہاں مقصود تھا۔(18*)

✡ ✡ ✡

مغرب کی علمی اساس

سترہویں اٹھاریں صدی میں مغرب میں گندی نالی میں کیڑوں کی طرح ہر طرف عالم جنم لے رہے تھے جن کی کوئی علمی سوچ نہ تھی بلکہ وہ صرف مسلمانوں کی نقالی کو علم سمجھتے تھے۔ چنانچہ فلسفہ ہو یا سائنس مغرب کے علماء نے انسان کو صرف یہ درس دیا کہ وہ خدا کا انکار کریں اس کے بعد ہی اُن پہ دنیاوی ترقی کے دروازے کھلیں گے۔ چنانچہ تھامس ہوبس ہو یا رینے ڈیکارٹ، فرانسس بیکن ہو یا ڈیوڈ ہیوم، برٹرنڈ رسل ہو یا ہربرٹ سپنسر، آگسٹ کومٹ ہو یا عمانویل کانٹ، شوپنہائیر ہو یا فریڈرک نٹشے سب کی تعلیمات میں ایک بات یکساں تھی کہ انسان اور کائنات کے باہمی تعلق میں کسی خالق کی کوئی گنجائش نہیں۔ خود مغرب کا معاشرہ بھی سائنس اور صنعت کے انقلاب میں مشغول تھا اور کلیسا کے جبر کو بھولا نہ تھا اس لیے وہ خود بھی کسی خالق سے کسی قدر بیزار تھا۔ اب عیسائیت کلیسا کی بڑی بڑی عمارتوں میں مقیّد تھی۔ پادری موجود تھا چرچ موجود تھا مگر عیسائی موجود نہ تھے۔ اس لیے کہ عیسائیوں کے پاس اب وقت نہیں تھا کہ وہ چرچ میں اپنا وقت برباد کریں۔ انھوں نے زبان سے خدا کا انکار نہیں کیا تھا بلکہ اپنے عمل سے خدا کا انکار کیا تھا۔ اوپر سے اُن کا ہر صاحب دانش اُن کو یہی بتا رہا تھا

کہ یہ کائنات محض اتفاق سے وجود میں آ گئی تھی اس کا کوئی خالق نہیں۔لوگوں کو یہ نظریات پسند آ رہے تھے کہ وہ بھی اپنے دل میں اب چرچ سے کوئی عقیدت محسوس نہ کرتے تھے۔اُن کے علم کا عمومی مزاج خدا کے انکار پہ رکھا تھا۔ بہت سے محققین اور سائنس دانوں نے اپنی تحقیق کو اس طرح پیش کیا جس سے لوگوں میں مذہب بیزاری کے جذبات پیدا ہوں۔

رفتہ رفتہ مغربی معاشرہ مادیت کی اُن راہوں کو چل نکلا جس میں کسی خالق کی کوئی گنجائش نہ تھی۔تاہم انیسویں صدی میں تین سکالرز نے اہل مغرب کی زندگی پہ انمٹ نقوش چھوڑے اور وہ انھی نظریات کے اثیر ہو کے رہ گئے جن کی طرف اِن تین لوگوں نے اُن کو بلایا تھا۔اُن تین لوگوں کے نام یہ ہیں سر چارلس ڈارون، سگمنڈ فرائیڈ اور کارل مارکس۔یہی وہ تین لوگ تھے جنھوں نے انیسویں صدی میں وہ انقلاب بپا کیا جس کے بعد عملی طور پہ اہل مغرب دین اور روحانیت سے بہت دور اور مادیت اور الحاد سے بہت قریب ہو گئے۔

ڈارون، مارکس اور فرائیڈ کے نظریات میں مشترک قدر یہ تھی کہ اُن تینوں نے خدا کا انکار کیا۔

ڈارون نے کہا:

☜ انسان بن مانس کی اولاد ہے اور ترقی کے زینے طے کرتا ہوا موجودہ ہیت تک پہنچا ہے۔ اُس کا کوئی خالق نہیں وہ خود بخود ہی پیدا ہو گیا تھا۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

فرائیڈ نے کہا:

☜ انسان کے تمام جذبات ایک بنیادی جذبہ سے پیدا ہوتے ہیں جس کو شہوت کہا جاتا ہے۔اور جنسی جذبہ ہی سب سے شدید جذبہ ہے یہی جذبہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے ۔ وہ دوسرے نفسیات دانوں کی طرح روٹی کپڑا اور مکان کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار نہیں دیتا بلکہ کہتا

ہے کہ انسان کا سب سے پہلا حق شہوانی جذبہ کی تسکین ہے۔

✡✡✡✡✡✡

مارکس نے کہا:

☜ انسان کی نجات اس میں ہے کہ وہ معاشی رفعت حاصل کرے۔ دولت ہی میں تمام تر خوشی ہے اور تمام جذبے دولت ہی سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ وہ دولت ہی کو انسان کی پہلی اور آخری منزل قرار دیتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

آج مغرب کا ہر شہری انھی نظریات کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ پولینڈ کا کوئی شہری ہو یا آسٹریا کا کوئی حجام، ناروے کا کوئی استاد ہو یا انگلستان کا کوئی پولیس مین، ڈنمارک کا کوئی دیہاتی ہو یا سویٹزرلینڈ کا کوئی گھڑی ساز، پیرس کا تاجر ہو یا نیویارک کا بینکرز۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کارلس مارکس ڈارون یا فرائیڈ کو جانتے ہوں۔ مگر اُن کی زندگی کے چوبیس گھنٹوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ سب اُنھی نظریات کے پیروکار ہیں جو اِن لوگوں نے مغرب کو دیئے تھے۔ اُن کے دن کا آغاز شراب سے ہوتا ہے۔ اُن کا سارا دن سودی کاروبار میں صرف ہوتا ہے یا وہ کوئی بھی کام کرتے ہوں دولت حاصل کرنے کا جنون قدرِ مشترک ہے۔ اُن کی رات زنا اور شراب کے نشے میں بسر ہوتی ہے اور وہ کسی خالق کے ذرا بھی احسان مند نہیں جس نے انھیں طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ بلکہ اُن تمام کی مشترکہ سوچ یہی ہے کہ جو کچھ انھیں حاصل ہے وہ اُن کی اپنی محنت اور ذہانت کا نتیجہ ہے اور وہ اس طرزِ زیست سے بالکل مطمئن ہیں جس کو انھوں نے اپنا رکھا ہے۔ اپنی سماجی برائیوں، اخلاقی پستیوں، روحانی کمیوں اور انسانیت سے فروتر اس تخیل زیست پہ نظر ثانی کرنے کے لیے نہ تو اُن کے پاس وقت ہے اور نہ ہی وہ کسی سنجیدہ سوچ کے حامل ہیں کہ وہ زندگی کی

مقصدیت پہ غور کریں۔ اُن کے نزدیک زندگی خوشی کے حصول کا نام ہے اور خوشی سے اُن کی مراد عیاشی ہے۔ مغرب نے اپنی قدیم روایات سے انحراف کی راہ کو اپنایا ہے جس کے باعث اُن کے معاشرے عجیب سی پست صورت اختیار کر گئے ہیں کہ اُن کی موجود نسل میں اسی فیصد نوجوانوں کو اپنی ماں کا نام تو معلوم ہے کہ وہ اس کے پیٹ میں نو مہینے تک مقیم رہے ہیں مگر انھیں اپنے باپ کا نام معلوم نہیں کہ وہ کس کے نطفے ہیں۔ بلکہ شاید اُن کی ماں کو بھی درست طور پہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس کا بچہ ہے۔ کیونکہ وہ ہر روز مانع حمل گولیاں کھا کر ایک نئی گود سجاتی ہے تو اسے کیا معلوم یہ ناپسندیدہ مہمان کس رات اُس کے وجود کا حصہ بن گیا۔ حالانکہ نہ اُس کی ماں کو اس کی خواہش تھی اور نہ ہی اُس کا باپ اس جھنجٹ کو پالنے کا خواہش مند تھا۔ وہ تو محض وقتی خوشی حاصل کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے اور اگلی صبح انھوں نے جدا ہو جانا تھا اور اگلی رات کے لیے نیا ساتھی تلاش کرنا تھا۔ اسی تگ ودو میں اُن کی جوانی گذر جاتی ہے اور وہ کسی اولڈ ہوم میں بوسیدہ اور بو دیتے گوشت کی طرح سوچتے ہیں کیا زندگی یہی ہے۔

مگر وہ اسی زندگی کو اپنائے ہوئے ہیں اور کیوں اپنائے ہوئے ہیں اس کا صاف اور سیدھا جواب تو یہ ہے کہ جب وہ کسی خالق کے وجود کے انکاری ہیں تو خالق کی رحمت بھی اُن سے دور ہے۔ اس لیے چار روزہ زندگی کو وہ خوشی کی تلاش میں گزار دیتے ہیں اور صحرا میں بھٹکے کسی مسافر کی طرح سراب ہی کو منزل سمجھ لیتے ہیں۔ اُن کی زندگیوں کو اِن راہوں پہ ڈالنے کے لیے جو علمی اور عقلی استدلال فراہم کیا جاتا ہے وہ مارکس، فرائیڈ اور ڈارون ہی کے نظریات سے فراہم کیا جاتا ہے۔ ڈارون، فرائیڈ اور مارکس کی تعلیمات ہی مغربی نظریہ حیات کے بنیادی پتھر ہیں جن پر لادینی مادہ پرست مدنیت کی عمارت استوار کی گئی ہے۔ یہی نظریات مغربی تہذیب کا سر چشمہ ہیں۔ انھی نظریات نے مغربی ممالک کے باشندوں کے طرزِ زیست کو متعین کیا ہے۔ اِن فلاسفر کے نظریات اہل مغرب میں دور تک سرایت کر گئے ہیں اور اُن کا بسیط اثر آج تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یورپی اقوام کا طرزِ عمل اس بات کا غماز ہے۔ مثال کے طور پہ دیکھیں کہ ڈارون نے کہا کہ فطرت یہی ہے کہ طاقتور کمزور کو کچل

دے۔آج مغرب اسی پہ عمل پیرا ہے۔انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ جس چیز کو علمی طور پہ فطری سمجھ لیتی ہے عملی زندگی میں اسی کو درست قرار دے لیتی ہے۔ڈارون کا نظریہ ارتقاء کمزور کی فنا اور قوی کی کامیابی کی بنا پہ منتج ہونے والی کشمکش حیات میں اسی طرزِ عمل کو فطرت قرار دے رہا ہے۔اسی کے مد نظر انسان کی عملی زندگی میں افراد اقوام اور طبقات کی کشمکش بھی فطری اور درست قرار پاتی ہے اور اس کے نتیجے میں قوی کا کمزور کو نگل جانا بھی فطرت قرار پا تا ہے۔دیکھیں کہ آج مغرب بالکل اسی قانون پہ عمل پیرا ہے وہ اقوام کا استحصال کر رہا ہے۔کہیں انھیں معاشی شکنجوں میں جکڑ رکھا ہے تو دیگر اقوام کو طاقت کے بل پہ دبا رکھا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے اس نقطہ نظر نے دنیا کا چہرہ لہولوہان کر رکھا ہے۔

اِن فلاسفہ کے نظریات سے پہلے دنیا ایسی نہ تھی۔تب دنیا میں رواداری اور اخلاق کا چلن تھا۔لوگ بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں سوچتے تھے۔اب لوگ صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتے ہیں۔مغرب کا معاشرہ بھی اس سے قبل ایک مذہبی معاشرہ تھا۔معاشرے میں مذہبی اخلاق کا ایک وقار تھا جسے ڈارون جیسے بے عقلوں نے چھین لیا۔تب مغرب میں بالعموم اُس مذہبی تصورِ مساوات کا کسی قدر تخیل موجود تھا جو اُن کے پیغمبر لے کے آئے تھے۔مذہبی اخلاقیات کے باعث طاقتور اور کمزور کے حقوق یکساں تھے اور طاقتور کے ہاتھ کمزور کی حق تلفی کے خلاف آواز اٹھائی جا سکتی تھی۔ تاہم ڈارون کے نظریات سامنے آنے کے بعد اُس کے نظریہ ارتقاء نے پہلی بار انسانوں کے ذہن میں اس خلجان کو پیدا کیا کہ طاقت ور کا کمزور کو نگل جانا اصول فطرت کے خلاف نہیں بلکہ عین فطرت ہے۔طاقتور اقوام کا کمزور اقوام کو دبائے چلے جانے کا جواز بھی اسی ذہنیت کی پیداوار ہے۔نسلی برتری اور امتیاز کے نظریئے بھی اس سر چشمہ سے سیراب ہوتے ہیں۔چنانچہ نئی تہذیب کے اس رجحان اور نظریہ نے قدیم اخلاقی قدروں کو نگل لیا۔نئی روشنی کے دلدادہ نئے نظریات کو خوشی سے قبول کر رہے تھے مگر قدامت پسند اور روایت پسند حلقوں سے ڈارون کے اس غیر انسانی اور غیر اخلاقی نظریہ حیات کے خلاف آواز اٹھائی جا رہی تھی۔اِن میں سب سے بلند آواز مذہبی حلقوں کی

تھی۔ چنانچہ معاشرے پہ ایک دباؤ بن گیا جس کے باعث جدت پسندوں نے اس مسئلے کا ایک نیا حل ڈھونڈ نکالا۔ وہ حل یہ تھا کہ قدامت پسندوں کی ہاں میں ہاں ملائی جائے مگر عملی طور پہ نئے رجحانات اور نظریات کو اپنائے رکھا جائے۔ اس مصلحت بینی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی روشنی کے پیروکار کے لیے ریا کاری کوئی عیب نہ رہی بلکہ ایک ہنر بن گئی آرٹ قرار پائی۔ قبل ازیں انسان کے ظاہر اور باطن کا ایک ہونا مذہبی اقدار میں سے ایک اہم اخلاقی قدر تھی جس کے گرد فرد اور اقوام کی تقدیریں گھومتی تھیں۔ لیکن ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے غیر مرئی اثر نے اس انمول مذہبی قدر کو بری طرح کچل ڈالا اور ریا کاری معاشرے کا معمول قرار پائی۔ دلوں میں بغض و عناد کے باوجود خندہ پیشانی سے ملنا، بظاہر انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مبہم اور صقیل الفاظ استعمال کرنا اور میڈیا کے سامنے الفاظ کے ہیر پھیر سے خود کو حق پہ ظاہر کرنا جدید دور کا سفارتی ادب قرار پایا۔ چنانچہ اُن معاشروں میں چالاکی ،عیاری اور مکاری کو اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ ایمانداری اور سچائی کو سادہ لوحی قرار دیا جانے لگا۔

یہ الفاظ تحریر کرتے ہوئے مجھے وہ منظر یاد آ رہا ہے جب امریکی سیکریٹری دفاع نے چمکتی دمکتی روشنیوں میں کیمرے کے سامنے آ کر کہا کہ عراق پر حملہ دراصل غلط اطلاعات کی بنا پہ کیا گیا تھا تاہم مقاصد حاصل کر لیے گئے ہیں۔ تب اُس کے چہرے پہ دس لاکھ عراقیوں جن میں چار لاکھ دس سال سے چھوٹی عمر کے بچے بھی شامل تھے کے خون ناحق پہ ندامت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ یہی ڈارون ازم ہے۔ کوئی ایک شخص جو کمزور ہو قتل کے بدلے قتل کر دیا جاتا ہے اور جو طاقت ور ہو دس لاکھ لوگوں کا قاتل ہو وہ مصنوعی خوشبوؤں سے مہکتے سوٹ، چمکتے دمکتے بڑے بڑے ہالوں میں بلند مسند پہ کھڑے ہو کر کیمروں کی کھنکھناتی روشنیوں میں زیر لب مسکراتے ہوئے دس لاکھ لوگوں کے قتل کا اعتراف کرتا ہے مگر دنیا کی کوئی عدالت اس قاتل کو مجرم قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ یہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہی تھا کہ انسان اپنے حیوانی آباؤ اجداد کی خصلتوں کی طرف عود کرنے پہ مجبور ہوا۔ اور ظاہر ہے اُن باپ بندر تھا جو جنگل میں رہتا ہے تو اس کے منطقی نتیجے کے طور پہ انھوں نے اس دنیا میں جنگل ہی کا

قانون رائج کیا۔ ذرا سی گہری نگاہ ڈالیں۔ اپنے اردگرد دیکھیں۔ عالمی سیاست کی چالبازیوں پہ صرف چند لمحے غور کریں تو آپ جان جائیں گے کہ واقعتاً آج دنیا میں جنگل ہی کا قانون رائج ہے۔ ڈارون ہی کا نظریہ ارتقاء پھل پھول رہا ہے۔ آج مغربی اور طاقتور اقوام UNO میں دنیا کے تمام تر مسائل اسی قانون کے تحت حل کرتی ہیں۔ مظلوم کی آواز اُس کے گلے میں پھنس کے رہ گئی ہے۔ اور زبردست قوتیں کھاتی بھی ہیں اور غراتی بھی ہیں۔ جب کسی معالے پہ رائے شماری کا وقت آتا ہے تو کمزور اقوام کو حق کے خلاف ناحق کی حمایت پہ مجبور بھی کرتی ہیں ایک نہیں ہزاروں مسئلے اس کے شاہد ہیں۔ تفصیلات سے تمام عالم کے اخبارات بھرے پڑے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

پھر فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات ہیں جن میں کھلے طور پہ انسان کو جنسی حیوان قرار دیا گیا ہے۔ اُس نے جنسی بے راہ روی کو عین فطرت کی پکار بتایا ہے۔ فرائیڈ نے کہا کہ اخلاقی بندشوں سے انسان میں جو ردعمل پیدا ہوتا ہے اسی سے بیماریاں جنم لیتی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کو کھلی جنسی آزادی ہو جس طرح سور اور کتا جنسی آزادی پہ یقین رکھتے ہیں اور نام نہاد اخلاقی قدروں کی پرواہ نہیں کرتے اسی طرح انسان کو بھی سور اور کتا بن جانا چاہیے جب اُسے ضرورت محسوس ہو تو اُسے صرف عورت کی ضرورت ہے چاہے وہ اس کی بہن ہو یا بیٹی۔ ذرا غور کریں کیا مغرب فرائیڈ کی بات پہ ایمان نہیں لے آیا۔ جواب یہ ہے کہ ہاں آج مغرب فرائیڈ ہی کے جنسی نظریات کا پیرو ہے اور جنسی حیوان بن چکا ہے۔ وہاں محرمات کی بھی کوئی قید نہیں۔ اگرچہ عام طور پہ ایسا نہیں ہوتا کہ انسان میں شرف کا احساس کبھی کتے اور سور کی اخلاقی پستی تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ آج کا مغربی شہری فرائیڈ کے تخیل حیات کے عین مطابق جنسی حیوان بن چکا ہے۔ وہ زندگی کا ساتھی نہیں بلکہ ایک رات کا ساتھی چاہتا ہے۔ وہ بچے پیدا نہیں کرنا چاہتا کہ اُن کو پالنے کے لیے اُس کے پاس وقت نہیں۔ چنانچہ ناروے، سویڈن آسٹریلیا، کینیڈا اور کئی دیگر مغربی ممالک میں حکومتیں مراعات اور

انعامات کا اعلان کر کر کے تھک گئی ہیں کہ کون سا جوڑا ہے نا جائز ہی سہی مگر دوسرا بچہ پیدا کرے اور ہم سے اتنا انعام لے جائے کیونکہ اِن اقوام کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ آئندہ صدی میں شاید کوئی اُن کا نام لیوا ہی نہ باقی بچے۔ قدیم عیسائی تہذیب کے محافظ آخر انگلستان کا بھی یہی حال ہے اور اس بات کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ عنقریب اُن کی اپنی آبادی تارکین وطن سے کم ہو جائے گی اور ملک کے قوانین تارکین وطن بنایا کریں گے۔ یاد رہے کہ انگلستان میں مشرقی ممالک کے باشندوں کی تعداد کئی کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ مگر یہ سب کیا ہے۔ یہ فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ یہ فرائیڈ کی گندی ذہنیت کا عکس ہے کہ اُس نے انسان کو اخلاقی قدروں سے منہ موڑنے کی دعوت دی اور اُسے کتے اور سور کے برابر بنا دیا۔ یہ الہامی اخلاقی اقدار سے انحراف کی سزا ہے کہ اہل مغرب اپنی نئی نسل کو عورت کے رحم میں جانے سے روک دیتے ہیں اور اسے اٹھا کر کونے میں پڑے کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیتے ہیں۔ فرائیڈ نے عورت کو گھر سے باہر نکال دیا۔ عورت بے حیائی کا آلہ بن کے رہ گئی۔ وہ کسی کے دل کے رانی ہونے کے بجائے شمع محفل بن گئی۔ کنواری ماں بننا عیب نہ رہا۔ حرامی بچوں کی کثیر تعداد مغربی حکمرانوں کے لیے دردسر بن کے رہ گئی اور یہی فرائیڈ کے علم کا ثمر تھا۔ پھر مارکس نے مادی الحاد کو آخری دلیل فراہم کر دی۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون اور فرائیڈ کے تیار کردہ معاشروں میں دولت کی ناہموار تقسیم، سرمایہ داروں کی عیاشی، غریبوں کی فاقہ کشی اور اخلاقی قدروں کے فقدان نے کارل مارکس کے نظریہ اشتراکیت کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ چنانچہ مزدور کی بے بسی جب انتہا کو پہنچی تو اُس نے غضب ناک ہو کے کروٹ لی اور ہر قید و بند سے آزاد ہو کر وحشی جانور کی طرح سرمایہ دار پہ ٹوٹ پڑا۔ جوش غضب میں اُس نے سرمایہ دار کے ساتھ ساتھ اخلاق و مذہب کو بھی تہ تیغ کر دیا۔ روس کے خونی انقلاب میں سرمایہ داروں کے ساتھ مذہبی اجارہ داروں کو بھی چن چن کے قتل کیا گیا کہ ڈارون اور فرائیڈ کی طرح مارکس کے نظریہ

حیات میں بھی کسی خدا کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ اشتراکیوں نے مذہب اور سرمایہ کی لاش پہ مزدوروں کی تنظیم کے ساتھ ایک ایسی تحریک منظّم کی جس میں دولت کی مساوی تقسیم کے ساتھ ساتھ تمام تر انسانی دکھوں سے نجات کا مژدہ سنایا گیا تھا۔ مگر خالق کے تصور سے عاری اس نظام حیات کا ہماری نظروں کے سامنے جو عبرت انگیز انجام ظاہر ہوا اس سے انسانیت نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

✡ ✡ ✡

نظریہ اور عمل

اوپر بیان کئے گئے نظریات سے یہ بات مترشح ہو جاتی ہے کہ اہل مغرب ہوں یا وہ دیگر تمام اقوام جنھوں نے خود کو خالق کے تصور سے آزاد کر لیا ہے اُن کی زندگی میں کامیابی و خیر و فلاح کا تصور اُن اقوام سے بالکل الگ ہے جو کسی خالق کے تصور کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور یہ اس لیے ہے کہ انسان کا ہر عمل اُس تصورِ زیست کے تحت ہوتا ہے جس کو اس کے ذہن نے قبول کر لیا ہوتا ہے۔ اور ہر تصورِ زیست کے پیچھے ایک نظریہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جن قوموں کے نظریات ڈارون مارکس اور فرائیڈ جیسے لوگوں نے وضع کیے ہوں ان کے اعمال، اُن کے خیالات اور اُن کا تصورِ فلاح یقیناً ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آج کے مغرب میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ہر سو سڑکوں پر ٹریفک کا شور ہے، بازاروں میں خریداروں کا ہجوم ہے، لوگوں کا ایک انبوہ ہے جو جانے کس طرف جانے کو بیتاب ہے۔ اُس کی چال میں تیزی اُس کی بیتابی کا پتا دیتی ہے۔ اُس کی عجلت میں کچھ کھو جانے کا ڈر ہے، اُس کے اطوار میں بے اعتدالی اُس کی زندگی میں موجود عدم توازن کی شاہد ہے۔ وہ کامیابی کے حصول میں باؤلا ہوا جا

رہا ہے۔ ناکامی کا خوف اُسے سکون کی نیند بھی نہیں لینے دیتا۔اُس کی کامیابی کیا ہے؟ اُسے کس ناکامی کا ڈر کھائے جاتا ہے؟ اُس کے پاس سب کچھ تو ہے پھر بھی وہ کیوں ہلکان ہوا جاتا ہے۔کیا اُس کے ذہن کی رو بہک گئی ہے یا اُس کی رہنمائی غلط منزل کی طرف کر دی گئی ہے۔جب اُس کے اہداف کو دیکھا جائے تو یہ بات کھل جاتی ہے کہ اُس کو غلط منزل کا پتا دیا گیا ہے۔وہ جس راہ میں عجلت سے بھاگا جا رہا ہے،وہ جس منزل کی خاطر اپنوں اور بیگانوں کا حق مارے بے دریغ بھاگ رہا ہے اُسے کون بتائے کہ وہ تو اُس کی منزل ہی نہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ عمومی طور پر انسان اپنی حقیقی منزل کو فراموش کر چکا ہے اور محض سراب کے تعاقب میں ہے۔اس حقیقت کا کتابِ ہدایت میں برملا تذکرہ موجود ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَالْعَصْرِ ○ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ○

القرآن الحکیم (سورۃ والعصر 103/2-1)

ترجمہ:

"عصر کی قسم بے شک انسان خسارے میں ہے"۔

✡✡✡✡✡✡

جس ناکامی اور جس نعمت کے چھن جانے کا خوف اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے وہ تو دینے والے کی امانت ہے،وہ جب چاہے اُسے واپس لے لے گا پھر خوف کس بات کا ہے۔مگر انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ جو نعمت اُسے حاصل ہوتی ہے وہ اسے خالق کے فضل کی بجائے اپنے ہاتھ کی کمائی سمجھتا ہے اس لیے جب نعمت اُس سے چھین لی جائے تو وہ کہتا ہے یہ کیا ہو گیا۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ کامیابی اصل میں ہے کیا؟؟؟

دنیا کے مختلف خطوں میں،مختلف زبان بولنے والی،مختلف خیالات رکھنے والی،مختلف لباس پہننے

والی، مختلف تہذیب وتمدن کی حامل اقوام بستی ہیں جن کے مذاہب بھی الگ الگ ہیں اور رسم و رواج میں بھی کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ اس لیے یقیناً دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے لوگوں کے نزدیک کامیابی وناکامی کا تصور بھی مختلف ہوگا۔ چنانچہ روس کے ایک کیمونسٹ کے نزدیک دولت کی مساوی تقسیم میں ہی کامیابی کا راز پنہاں ہے، امریکہ کے ایک سرمایہ دار کے نزدیک زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا ہی کامیابی کا معیار ہے، چینی ملحدین کے نزدیک اِن دِنوں پیداوار کے میدان میں دوسری تمام اقوام کو پیچھے چھوڑ جانے کا جنون سوار ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک پیداواری برتری ہی کامیابی کا معیار ہے، اسرائیل کے ایک یہودی کے نزدیک مسلمانوں پر ظلم ستم توڑنا کامیابی ہے۔ انحراف پہ مائل اور مادی نظریات پہ استوار معاشروں کے نزدیک کامیابی کے معیار دیکھیں اور دنیا کی بڑی بڑی اقوام اور مذاہب پر نگاہ ڈالیں تو اہل مغرب تمام کے تمام کامیابی کے ایک تصور پر یکجا دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کو اگرچہ ایک الہامی مذہب کے پیروکار ہونے کا دعوی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے دین عیسوی کو گرجا گھر میں مقید کر دیا ہے۔ اُن کے خیال میں مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے وہ چاہے تو اس معاملے میں سرگرم رہے چاہے تو اُسے پس پشت ڈال دے۔ اول اول جب اُن کے ہاں اس تصور نے جنم لیا تو مذہب سے والہانہ وابستگی رکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور مذہب سے منہ موڑنے والوں کی تعداد کم تھی۔ تاہم نفس ہمیشہ ہدایت کی پیروی میں آڑے آتا ہے اس لیے رفتہ رفتہ اہل مغرب تمام تر مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے گئے اور نفس کے بندے بن کے رہ گئے۔ انھوں نے اُس آسمانی ہدایت کو چھوڑ دیا جس کے متعلق قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ :

وَفِی نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الاعراف 7/54)

ترجمہ:

''اور اُس تحریر (تورات) میں ہدایت اور رحمت تھی اُن کے لیے جو اپنے رب سے خوف رکھتے ہیں''۔

✡✡✡✡✡✡

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اہل مغرب کے اعمال و افعال پر تاریخی تناظر میں بھی ایک نظر ڈال لی جائے کہ انکار کی عادت صدیوں میں پختہ ہوتی ہے، مادیت اُن میں ہمیشہ سے موجود رہی تھی اسی لیے تو وہ ذرا ذرا سے فائدے کے لیے اللہ کی آیات کو بیچ دیا کرتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اللہ کے رسول اُن کو جس بات کی طرف بلا رہے ہیں وہی سچ ہے، اس کے باوجود انھوں نے اپنے نفس کی آواز پر کان دھرے اور اللہ کے احکام کا انکار کیا، اللہ کے رسولوں کا انکار کیا اللہ کے رسولوں کو اذیت پہنچائی، اللہ کے رسولوں کا راستہ روکا، اللہ کے رسولوں کو قتل کیا، یہی وجہ ہے کہ انھیں ایک مردود قوم قرار دے دیا گیا۔

قرآن حکیم میں اِن اقوام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ :

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاء فَلاَ تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلاَ تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَناً قَلِيلاً وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ○ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالأَنفَ بِالأَنفِ وَالأُذُنَ بِالأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ

كَفَّارَةٌ لَّهُ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ وَقَفَّيْنَا عَلَى آثَارِهِم بِعَيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ○وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فِيهِ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ○وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ عَمَّا جَاءكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً وَلَوْ شَاء اللّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَـكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُم فَاسْتَبِقُوا الخَيْرَاتِ إِلَى الله مَرْجِعُكُمْ جَمِيعاً فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ○وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللّهُ إِلَيْكَ فَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيراً مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ○أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 44-50/5)

ترجمہ:

''ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی جو مسلم تھے اسی کے مطابق اِن یہودی بن جانے والوں کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اسی طرح ربانی اور احبار اسی پر فیصلہ کرتے تھے کیونکہ انھیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اُس پر گواہ تھے۔ پس اے گروہ یہود تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ڈرو، اور میری آیات کو ذرا ذرا سا معاوضہ لے کر بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں ہم نے یہودیوں پر حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان دانت کے بدلے دانت، اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ ہے، پھر جو قصاص کا صدقہ کرے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔ پھر ہم نے اِن پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، تورات میں جو کچھ اُس کے سامنے موجود تھا وہ اُس کی تصدیق کرنے والا تھا اور ہم نے اُس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اُس وقت موجود تھا اُس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے فیصلہ کریں اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔ پھر اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب (قرآن) بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے والی اور محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا تم خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمھارے پاس آیا ہے اِس سے منہ موڑ کر اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی ہے۔ اگرچہ تمھارا خدا چاہتا تو وہ تم سب کو ایک

امت بھی بنا سکتا تھا۔لیکن خدا نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔لہٰذا بھلائیوں میں سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو کہ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے پھر وہ تمھارے سامنے اصل حقیقت کو کھول دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔پس اے محمد ﷺ تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق اِن لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تمھیں فتنہ میں ڈال کر اِس ہدایت سے ذرا برابر بھی منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔پھر اگر یہ اِس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے اِن کے بعض گناہوں کی پاداش میں اُن کو مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اِن لوگوں میں اکثر فاسق ہیں۔تو کیا پھر یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں اُن کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

آج دو ہزار سال ہونے کو آئے اِن اقوام کے طرزِ عمل میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔وہ کل بھی گمراہ تھیں وہ آج بھی گمراہ ہیں،اللہ کے نازل کردہ قوانین کا انھوں نے کل بھی انکار کیا تھا اور آج بھی وہ انکار پہ ہی کاربند ہیں،وہ کل بھی نفس کی پکار پہ مطمئن تھے اور آج بھی آوازِ نفس ہی اُن کی منزل ہے،کل بھی فحاشی اور بدکاری اُن کو مرغوب تھی اور آج بھی شہوت رانی میں دنیا میں سب سے آگے وہی ہیں۔کل بھی اُن کی آنکھوں میں حیا نہ تھی آج بھی اُن کی آنکھوں میں حیا نہیں ہے،کل بھی ذرا سے فائدے کے لیے وہ عدل سے پھر جاتی تھیں آج بھی اُن کا جھوٹ ضرب المثل ہے،کل بھی دوسروں کا حق کھا جانا اُن کا شیوہ تھا آج بھی مادیت ہی اُن کی منزل قرار پائی ہے،کل بھی وہ کتاب اللہ کے انکاری تھے آج بھی انھیں کتاب اللہ کی کوئی پرواہ نہیں

کل بھی وہ مسلمانوں سے حسد کرتے تھے آج بھی وہ مسلمانوں سے حسد کرتے ہیں، کل بھی وہ اللہ کا حکم ماننے کے لیے تیار نہ تھے آج بھی وہ اللہ کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں، کل بھی وہ عقل کے اندھے تھے آج بھی وہ عقل کے اندھے ہیں، کل بھی وہ شراب کے رسیا تھے آج بھی وہ شراب کے بغیر نہیں جی سکتے، کل بھی سود اُن کی محبوب معیشت تھی آج بھی سب سے بڑے سود خور وہی ہیں، کل بھی وہ ظالم تھے آج بھی وہی ظالم ہیں، کل بھی وہ بزدل تھے آج بھی وہ بزدل ہیں، کل بھی وہ جاہل تھے آج بھی وہ جاہل ہیں، کل بھی وہ جھوٹے تھے آج بھی وہ جھوٹے ہیں اور اُن کے جھوٹ کی گواہی دیتے تاریخ کے صفحات سیاہ ہو رہے ہیں۔ یہ اگرچہ ایک طویل تذکرہ ہے کہ مغرب کا وہ معاشرہ جو آج ہمارے سامنے ہے جس نے دنیا بھر کے لوگوں کو مادیت اور الحاد کی دعوت دی ہے وہ کن راہوں سے گزرتا ہوا پستی کے اس مقام تک پہنچا۔ آج کے مغرب کی شہوت رانی، مذہب سے دوری اور دولت اکٹھی کرنے کی ہوس کن بنیادوں سے ظاہر ہوئی۔ مختصراً اُن کا جائزہ لیے بغیر شاید بات پوری طرح واضح نہ ہو سکے۔

چنانچہ مورخین نے اس طویل تر تاریخی تسلسل کو بیان کیا ہے اور الہامی کتابوں نے بھی قوم یہود و نصاریٰ کے پست روز شب کو اپنا موضوع بنایا ہے اُن کی مدد سے ہم اُس بگاڑ کو جاننے کی کوشش کریں گے جو آج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ ایک الہامی مذہب کے پیرو تھے ایک مذہبی کتاب کے وارث تھے اور اُن کے دعویٰ کے مطابق تو وہ آج بھی اُس کتاب پہ کاربند ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اہل مغرب کا اب کسی بھی کتاب سے حقیقت میں کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ محض نفس کے پجاری ہیں اور نفس کی آواز ہی اُن کا عمل ہے اور وہ بے منزل مسافرت کے آزار میں ہیں۔ جہاں تک اُن کی کتاب کا تعلق ہے تو اِس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کتاب سے نوازا تھا اور وہ کتابِ ہدایت تھی قرآن حکیم میں اس بات کی تصدیق کی گئی ہے۔

ارشاد ہوا کہ :

ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَاماً عَلَى الَّذِيَ أَحْسَنَ وَتَفْصِيلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُم بِلِقَاء رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الانعام 6/154)

ترجمہ:

''ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی جو بھلائی کی روش اختیار والے انسان پر نعمت کی تکمیل کرتی اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت و رحمت تھی کہ شاید یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات پر یقین کریں''۔

✡✡✡✡✡✡

آج کا مغربی معاشرہ جن بنیادوں پر استوار ہوا ہے اُن میں کچھ موہوم سا عکس تو اُس کتاب کا موجود ہے جو اُن پہ اتاری گئی مگر بدقسمتی سے وہ عکس بھی اُن کی عبادت گاہوں اور سرکاری بیانات تک محدود ہو کے رہ گیا۔ ورنہ حقیقت میں بھی تو مغرب کا عام شہری چاہے وہ امریکہ سے تعلق رکھتا ہو یا انگلستان سے، فرانس کا شہری ہو یا ناروے کا، آسٹریلیا کا باشندہ ہو یا ہالینڈ کا شہری ہو، جرمنی کا باشندہ ہو یا اسپین کا شہری، اٹلی کا باشندہ ہو یا سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا ہو، طرزِ زیست میں کلی مشابہت رکھتا ہے۔ خیر و شر کا تصور ایک سا ہے، کامیابی و ناکامی کا معیار ایک ہے جنسی انارکی، معاشی تصورات، سماجی اقدار، تہذیبی افکار اور تمدنی معاملات میں تقریباً اتفاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انسانوں کا ایک انبوہ ہے جو حق و راستی سے آشنا نہیں۔ مغربی اقوام کے افکار کی بنیاد میں رومی تہذیب اور یونانی فلسفے کو بنیادی فکر و عمل کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ یورپی محققین نے اسلام سے تعصب کی بنا پر یونانی فلسفے کو کچھ اس طور پہ اور مبالغہ کی حد تک بیان کیا

ہے کہ علم وحی پر بھی اُسے فوقیت عطا کر دی۔ حالانکہ خود یونانی مذہب کے لحاظ سے محض ایک تصوراتی داستان کو اپنائے ہوئے تھے اور اُن کا فلسفہ اُس الجھے ہوئے گورکھ دھندے کا نام تھا جس نے تین ہزار سال پہلے اگر انسانیت کی کوئی خدمت کی ہو تو کی ہو آج کی اس دنیا میں جب قرآن حکیم جیسی عظیم کتاب کُل عالم کو راہ نجات دکھا رہی ہے تو اُس قدیم یونانی فلسفے کو سورج کے مقابلے میں چراغ کی حیثیت بھی حاصل نہیں رہی۔ یونانی فکر و فلسفہ کا بڑا بگاڑ یہ ہے کہ اُس میں روح کو قطعی طور پہ نظر انداز کر کے عقل کو لامحدود اہمیت عطا کر دی گئی۔ غالباً اسی بنیاد پر مغرب کے دانشور نے کہا کہ یونانی فکر و فلسفہ میں انسانی رفعت اور اس کی ایجابیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ عقل کو لامحدود قرار دینے اور اسے روح پر مقدم کرنے کے نتیجے میں اُس انسانی تہذیب نے سر اٹھایا جس نے رفتہ رفتہ خالق کا بھی انکار کر دیا۔ اس لیے کہ جب ہر وجود کو ناپنے کا پیمانہ عقل ہی ٹھہری تو خالق کا وجود بھی اسی قدر قابل عمل تصور کیا گیا جہاں تک عقل کی رسائی ممکن ہو سکے۔ تاہم چونکہ اہل مغرب خود کو ایک الہامی مذہب کا پیرو گردانتے ہیں اس لیے بہرحال اللہ کے وجود کو عقل کے فریم میں نصب کرنے کی بھونڈی کوششیں جاری رہیں۔ رہ گیا اللہ کا روحانی عرفان تو اس کا وجود یونانی جاہلیت میں بہت ہی کمزور تھا۔ پھر رومی انداز فکر تھا جس نے جب عیسایت قبول کی تو بجائے اس کے کہ وہ عیسائیت قبول کرنے کی بنا پر اپنے فکر و نظر سے منحرف ہو جاتے انھوں نے عیسائیت کو اپنے اندازِ فکر کے مطابق ڈھال لیا۔ چنانچہ قرون وسطٰی میں دین عیسوی کے اعتقادی انحطاط کے متعلق مشہور برطانوی مورخ DR, Draper اپنی کتاب "Combet in religion and Science" میں لکھتے ہیں کہ :

"منافقین کی وجہ سے عیسائیت میں شرک و بت پرستی داخل ہو گئی۔ اِن منافقین نے اپنے آپ کو عیسائی ظاہر کر کے بڑے بڑے مناصب پر قبضہ جما لیا خود کانسٹائن کا بھی

یہی حال تھا اس نے اپنی ساری زندگی ظلم اور گناہوں میں گزاری اور سوائے زندگی کے آخری چند دِنوں کے اُس نے کبھی بھی کنیسہ کے مذہبی احکامات کی پابندی نہیں کی''۔

✡✡✡✡✡✡

دیگر تمام ادیان کی طرح مسیحیت بھی عقیدہ و شریعت پر مشتمل تھی ہر چند کہ انجیل میں احکامات کے متعلق زیادہ تفصیلات مذکور نہ تھیں بلکہ اس میں تورات کو بنیاد بنا کر بعض احکام میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی۔قرآن سے اسی بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا گیا کہ :

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/156)

ترجمہ:

''انجیل تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تاکہ میں حلال کردوں اُن بعض چیزوں کو جو اس سے قبل تم پہ حرام کردی گئی تھیں''۔

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ مسیحیت نے چند قوانین میں تبدیلی کے بعد تورات ہی کو نافذ کردیا تھا۔لیکن حقیقت میں جو کچھ ہوا اس میں مذہبی روح نام کو بھی نہ تھی۔اس کے باوجود کہ قرون وسطیٰ میں یورپ میں کلیسا کو زبردست اقتدار حاصل ہوا پھر بھی قانون الٰہی صرف شخصی احوال تک محدود ہو کر رہ گیا اور زندگی کے بڑے حصے میں رومی قانون ہی نافذ العمل رہا۔گویا لوگوں کے ذہنوں پر

مذہب کا غلبہ ہونے کے باوجود قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں پائی جانے والی دین و دنیا کی آویزش قبیح جاہلیت کی مظہر ثابت ہوئی ۔ معاشرے پر کلیسا کے اثرات نہایت گہرے اور دوررس تھے اور لوگوں کے ذہن کلیسا کی عظمت سے مرعوب تھے۔ اس کے باوجود بھی زندگی کے سارے معاملات رومی قانون کے تحت ہی حل کیے جاتے تھے۔ یہ ایک ارادی عمل تھا جو اہلِ کلیسا نے اپنایا اور اس طرزِ عمل کے نتیجے میں رومی قانون کی توسیع اور ہمہ گیری کے لیے مواقع فراہم ہوتے رہے ۔ نتیجہ کے طور پر دین و دنیا میں دوئی پیدا ہوئی۔ لوگوں کے اذہان متاثر ہوئے۔ تب لوگوں کے ذہنوں پر دین و دنیا کی دوئی اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ کاہنوں نے دنیا کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا اور خود آسمانی بادشاہت کے وارث بن بیٹھے۔ تب یہ تصور عام تھا کہ جنت میں صرف وہی شخص جائے گا جسے کاہنوں کی خوشنودی حاصل ہو باقی سب اُس سے محروم رہیں گے۔

کلیسا کی گرفت معاشرے پر سخت تھی اس لیے کہ ریاست کی قوت اُس کی پشت پر موجود تھی ۔ چنانچہ کلیسا عوام سے جو حکم چاہتا منواتا۔ کلیسا نے جہاں لوگوں کو عقلی طور پر یرغمال بنا رکھا تھا وہیں اُس نے لوگوں کا معاشی استحصال بھی کر رکھا تھا۔ وہ لوگوں سے عشر ایسے وصول کرتا جیسے کہ تاوان وصول کیا جاتا ہے۔ لوگوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ کلیسا کی زمینوں پر مفت کام کریں اور بادشاہ کے لشکروں میں بغیر کسی اجرت کے شامل ہوں اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں لوگوں پر خدا کی بجائے لوگ ہی حکمران تھے۔ اگرچہ کلیسا نے مذہب کے نام پر جاہلیت کا جو نظام وضع کیا تھا اُس نے نہ تو انسانیت کو کچھ دیا اور نہ ہی دینِ عیسوی کو لوگوں کا پسندیدہ مذہب رہنے دیا۔ رہبانیت کے لیے جو خانقائیں قائم کی گئیں وہ بدکاری کے اڈوں میں تبدیل ہو کر رہ گئیں اس لیے کہ فطرت سے بغاوت انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔

✡✡✡✡✡✡

قرآن حکیم نے اُن کی اس جاہلیت کی طرف جا بجا اشارات نازل فرمائے گئے ہیں۔

سورۃ حدید میں ارشاد ہوا کہ!

وَرَہْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاء رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔

القرآن الحکیم (سورۃ الحدید 57/27)

ترجمہ:

"اور رہبانیت جو انھوں نے ایجاد کر لی تھی وہ ہم نے اُن پر فرض نہ کی تھی مگر اللہ کی رضا مندی کے لیے، لیکن انھوں نے اس کی پوری پوری رعایت نہ کی"۔

✡✡✡✡✡✡

دراصل تو اہل مغرب کے لیے دین مسیحیت ایک قید تھی جس سے نکلنے کے لیے وہ بیتاب تھے۔ تاہم اُن کے حکمرانوں اور کلیسا نے جب اس بات کو محسوس کیا تو انھوں نے ایک نئی چال چلی۔ انھوں نے پوری قوم کو مجتمع کیا اور مسلمانوں پر چڑھ دوڑے حالانکہ وہ ابھی اس قابل نہ تھے کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جس کے آخر میں انھیں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم یہ بات اُن کے فائدے میں گئی کہ لوگ دین مسیحیت پر ایک بار پھر مجتمع ہو گئے۔ صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے معاندانہ ٹکراؤ اور اسپین میں مسلمانوں سے مصالحانہ میل جول کا نتیجہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ نشاۃ ثانیہ اللہ کے راستے پر چلتی جو درحقیقت اسلامی تہذیب کی بنیاد تھی اس نے نہایت تندہی سے اسلام کا مقابلہ شروع کر دیا۔ اور یہ کلیسا کا ایک اور احمقانہ قدم تھا کلیسا لوگوں کو جاہل رکھنا چاہتا تھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر لوگوں نے علم حاصل کر لیا تو وہ کلیسا کی تمام تر جاہلیت اور عیاریوں سے آگاہ ہو جائیں گے۔ جیسا کہ اصول تاریخ ہے کہ آزادی

پسند لوگ ظالم حکمران کے لیے ہمیشہ دردِسر رہے ہیں اس لیے کلیسا اپنی ظالمانہ حکمرانی کو قائم رکھنے کے لیے شجرِ آزادی کو جڑ سے کاٹنے کی کوشش میں لگا رہا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ غیر دینی (Secular) بنیادوں پر ہوئی جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ لوگ عقیدے اور دین سے دور ہٹتے گئے۔ اہل یورپ نے مسلمانوں سے علم سیکھا، تہذیب سیکھی اور نظریہ آزادی حاصل کیا مسلمانوں سے تجربی علوم حاصل کیے اور انھی پر اپنی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔ یورپ نے مسلمانوں سے ہی ایک قوم بننا سیکھا۔ مگر جب اُن کو کچھ قوت حاصل ہوگئی تو انھوں نے اندلس کے مسلمان اہل علم کو سزائیں دینے کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کیں۔ جلد ہی وہ دور آ گیا جب تحریک اصلاح مذہب کے ساتھ ساتھ صنعتی انقلاب کی صدائیں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ نظام سرمایہ داری کے ابتدائی ایام تھے جس کی بنیادیں سود دھوکہ اور فریب پر رکھی ہوئی تھیں محنت کش کو اُس کی محنت کا انتہائی کم معاوضہ دیا جاتا۔ صنعتکار نے محنت کش پر انتہائی مظالم ڈھائے اور اُن کا خون چوسا تب کلیسا میں پراسرا خاموشی تھی۔

بجائے اس کے کہ کلیسا اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا مگر دینی مصلحین تو وجدان کی اصلاح کے چکر میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ سارا تذکرہ گیارہویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک کا تھا۔ پھر جب انیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو اُس کے دامن میں اہل مغرب کے لیے بہت کچھ تھا بلکہ وہ سب کچھ تھا جس کے وہ متمنی تھے اور جسے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے اور انیسویں صدی میں انھوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا وہ دین اور عقیدے کی قیمت پر حاصل کیا۔ اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں ہی اُس بلند و بالا اور عظیم تر صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی جا چکی تھی جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی وجہ بنی۔ چنانچہ انیسویں صدی اُن کے لیے نئی روشنی کی صدی ثابت ہوئی۔ جہاں ڈارونیت نے اُن کے افکار و نظریات کو روند ڈالا تو وہیں صنعتی انقلاب نے اہل مغرب سے اُن کے آبائی عقیدے کو بھی چھین لیا۔ انیسویں اور بیسوی صدی کو اگر اہل مغرب کی صدی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لیے کہ علم و فضل ہو یا فن و حرب، صنعت

وحرفت ہو یا تجارت ومعیشت ہر میدان میں مغرب کا ڈنکا ہی بج رہا تھا۔تاہم بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں پر مغرب کی گرفت کمزور ہوئی تو مسلمان بھی میدان عمل میں نکل آیا اگرچہ وہ زیست کے متعدد میدانوں میں ابھی تک مغرب سے کوسوں پیچھے ہے۔مگر سچ تو یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین کی قیمت پر اُس مادی آسائش کو حاصل کرنے پر کبھی رضامند نہ ہوا جس کا مغرب متمنی تھا۔مغرب نے معاشیات اور سماجیات میں جو میدان سجائے اُن میں اُسے اگرچہ کامیابی حاصل ہوئی۔مگر مادیت کی آخری منزل پر پہنچ کر جب اُس نے پیچھے دیکھا تو اُس نے جانا کہ وہ بہت کچھ کھو آیا ہے۔نسلوں پہ نسلیں بدلتیں رہیں جس کی وجہ سے اُن کے اندر سے رفتہ رفتہ احساس زیاں بھی جاتا رہا۔یہ سچ ہے کہ مغرب عسکریت اور معاشیات کے میدانوں میں دوسری بہت سی اقوام سے آگے نکل چکا ہے۔مگر یہ بھی سچ ہے کہ اُن کے ہاں انفرادی سکون مفقود ہے۔اُن کا فرد انفرادی طور پہ ایک اضطراب کا شکار ہے اور اُس سکون کا متمنی ہے جو اسے مادیت کی انتہا پر پہنچ کے بھی نہیں مل سکا۔صاحب دانش لوگوں نے اس امر کو جانا ہے کہ انسان روح اور جسم سے مرکب ہے۔روح کی آسائش خالق کی اطاعت میں ہے اور جسم کی آسائش مادیت میں ہے۔تو جب انسانوں کے ایک کثیر گروہ نے روحانیت کو پس پشت ڈال کر صرف مادیت کو اپنی منزل بنالیا تو منطقی طور پر اُن کی روح تشنہ رہ گئی اور یہ اضطراب اسی تشنگی کا مظہر ہے۔

مغرب نے خاندانی ڈھانچے کو کھودیا، محبت اور مروّت کے رشتوں سے منہ موڑ لیا، وہ صرف نفس کا پجاری بن کے رہ گیا۔مادیت اُس کی منزل اور شراب اُس کی خوراک اور شہوت اُس کی لذت بن کے رہ گئی۔سود اُس کا کاروبار اور استحصال اُس کا طرز زیست بن کے رہ گیا۔مغرب نے انسانیت کو کئی ہزار ایٹم بم اور تیسری دنیا کا تحفہ دیا۔دراصل تو یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ مغرب نے منزل کے تعین میں ٹھوکر کھائی۔انھوں نے قولاً تو خالق کے وجود کا انکار نہ کیا مگر عملاً انھوں نے خالق کے احکامات کو پس پشت ڈال دیا جس کی وجہ سے وہ اپنے اہداف حاصل

کرنے کے باوجود منزل سے کوسوں دور ہیں۔ روحانی خلا کے ساتھ ساتھ اُن کے اندر ایک بڑے اخلاقی بگاڑ نے بھی جنم لیا جس نے نہ صرف اُن کی زندگی کو اجیرن کیا بلکہ مغرب نے دور دور تک انسانیت کا چہرہ لہولہان کر رکھا ہے۔ خاص طور پہ اُن کا ہدف مسلمان ممالک ہیں جو اُس کے تمام اہداف و مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس تیل سمیت بے شمار معدنی دولت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ عسکری اور معاشی حوالوں سے قدرے کمزور مسلمان ممالک مغرب کا ہدف ہیں جن پر وہ آئے روز حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ مغرب نے مادیت کی منزل طے کرتے ہوئے سائنس کو اپنا معبود بنالیا۔ سائنس اگرچہ ایک مفید علم ہے مگر سائنس کو خدا بنالینا اہل مغرب جیسے کم عقلوں ہی کا کام تھا۔

علم سائنس کائنات کے بارے میں معلومات کا عمدہ وسیلہ ہے مگر سائنسی کارنامے دراصل اُس عقل ہی کے مرہون منت ہیں جو خالق کی طرف سے انسان کو عطا کی گئی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ مغرب نے سائنس کو الوہیت کے مقام پر بٹھا دیا اور اسے اپنی محبتوں عقیدتوں اور اطاعتوں کا واحد مرکز بنالیا۔ اہل مغرب کی اس افسوس ناک غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے تجرباتی سائنس کے تجربہ و مشاہدہ کے محدود وسائل کے سوا علم و معلومات کے باقی وسائل سے خود کو محروم کرلیا جس کے منطقی نتیجے کے طور پر مغرب کا عام آدمی منزل سے مزید دور ہوتا چلا گیا یہی مغرب کا انسانیت کو تحفہ ہے۔ انسان کے سامنے ایک وسیع کائنات پھیلی ہے مگر مغرب کی تنگ نظری کی وجہ سے تمام امکانات نظری و مادی سائنس کی ناگزیر محدودیتوں کی نذر ہو گئے۔

کیونکہ درحقیقت انسان جس علم کا محتاج ہے وہ عقل سے اگلی منزل پہ حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ سائنس جو عقل کے پروں سے اڑتی ہے انسانیت کی بلند پروازی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ وہ عقل اور روح دونوں سے مدد حاصل کرتی ہے اور تب کہیں اپنے خالق کا قرب اور حقیقت نفس الامری کا واضح اور صحیح شعور حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ مگر مغرب کا طریق مختلف تھا اُن کا تخیل ہے کہ صرف سائنس ہی وہ واحد ذریعہ علم ہے جو حیات اور کائنات کے سربستہ راز

منکشف کرسکتا ہے۔اوراس تخیل میں وہ اس قدر پختہ ہیں کہ علم وحی جیسے مقدس علم کو بھی علم سائنس کے مقابل حقیر جانتے ہیں۔اپنی جہالت اور کم فہمی کی بنا پر اہل مغرب شاید یہ نہیں جانتے کہ علم سائنس ہنوز اپنے ابتدائی دور میں ہے اوراب بھی بے شمار ایسے مسائل موجود ہیں جن کے بارے میں انسان کی معلومات نہ صرف محدود بلکہ قابل قدر حد تک ناکافی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ علم سائنس کا دائرہ اثر کافی محدود ہے اس کا مشاہدہ سطحی اوراس میں صلاحیت نہیں کہ وہ حقیقت کی تہہ تک سفر کرسکے۔

دراصل جب مغرب نے مذہب یعنی روحانیت سے منہ موڑا اور جدیدیت یعنی مادیت اور سائنس کے دامن میں پناہ گزیں ہوئے تو انھوں نے پہلا دعویٰ یہ کیا کہ روح کچھ بھی نہیں یہ محض انسانی واہمہ ہے۔اہل مغرب نے روح سے انکار کسی دلیل یا علم کی بنا پر نہیں کیا بلکہ اُس کی وجہ تجرباتی سائنس کی روح تک نارسائی اور ناکافی غیر موزوں آلات کا استعمال تھا۔دراصل اہل مغرب اسرار فطرت کی نقاب کشائی سائنس کے ذریعے کرنا چاہتا تھے مگر وہ بھول گئے کہ سائنس تو محض علم کی ایک شاخ ہے جب کہ خالق کل عالم کا مالک ہے اوراُسی کا علم ہے جو لامحدود ہے جس کی کوئی حد نہیں۔دوسری طرف مشیت ایزدی یہ تھی کہ اعلیٰ حقائق کو انسانی ادراک کی براہ راست گرفت سے باہر رکھا جائے۔یہی حکمت اور مصلحت تھی اور حکم ہمیشہ خالق ہی کا ہے۔

چنانچہ جب سائنس روح کے اسرار تک نہ پہنچ سکی تو اُن کم فہموں نے اسے سائنس کی محدودیت نہ جانا بلکہ روح کے انکار کو مناسب سمجھا اور یہی بات اُن کی ضلالت اور انکار کا باعث بن گئی۔ انھوں نے آخری نتیجے کے طور پہ اس بات کا علان کردیا کہ روح نامی کسی چیز کا دنیا میں کوئی وجود نہیں۔الغرض آج کی جدید اور بزعم خویش مہذب دنیا علمی جہالت کا وہ شاہکار ہے جس میں دورِ جدید کا انسان مبتلا ہے۔جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جدید یورپ قدیم یونانی تہذیب کا وارث ہے اور یہ تہذیبی ورثہ رومن ایمپائر کی وساطت سے یورپ تک پہنچا۔قدیم یونانی

تہذیب میں انسان اوراس کے دیوتاؤں کے باہمی تعلقات کی بڑی بھیانک تصویر پیش کی گئی ہے۔یونانی دیومالا کے مطابق انسان اور اُس کے دیوتا ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہے۔مورخین نے انسان اور یونانی دیوتاؤں کے مابین مستقل ٹکراؤ اور کھینچا تانی کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ قدرت کے سربستہ رازوں کوافشا کرنے میں انسان کو جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ اُن کے نزدیک انسان کے عزم واستقلال اور دیوتاؤں کی عاجزی اور بے بسی کا اظہار ہیں۔اُن کے مطابق اگراُن کے دیوتاؤں کا بس چلتا تو وہ کبھی انسان کو تحقیق واکتشاف کے کسی شعبے میں کامیاب نہ ہونے دیتے اورانسان اِن ساری آسائشوں اورسہولتوں سے محروم رہ جاتا جوقدرت کے خزانوں پر دسترس پانے کے نتیجے میں انسان کوحاصل ہوئی ہیں۔ اِس یونانی نقطہ نظر سے سائنس کی ہرنئی کامیابی اپنے حاسددیوتاؤں کے خلاف انسان کی فتح و کامرانی کا نیااعلان اوراُس کی برتری کا اثبات ہے۔یونانی تہذیب کی یہی وہ خبیث روح ہے جو جدید یورپ کے تحت الشعور میں ہمیشہ سے موجودرہی ہے۔اس کا اظہار کہیں تو حقائق و واقعات کی تعبیروتوجیہہ میں ہوتاہے اورکہیں خدا کے بارے میں یورپی رویے میں۔

یہی وجہ ہے کہ جدید یورپی سائنس دان سائنس کی کامرانیوں کو کچھ اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ گویا یہ انسان نے کسی برترقوت سے لڑکر حاصل کی ہیں اوراُن کے نتیجے میں فطرت کی قوتوں کو اپنا تابع فرما بنالیا ہے۔ چنانچہ اُن دیکھے خداؤں کے سامنے انسان جس عجز و نیاز مندی کا اظہار کرتا چلا آیا ہے اس کی اصل وجہ اس کے نزدیک انسان کا احساس عجز ہے۔مگر سائنس کو فطرت کے خلاف جو بے پناہ کامیابیاں حاصل ہورہی ہیں اُن کے نتیجے میں یہ انسانی احساس عجز رفتہ رفتہ خود بخود مٹ جائے گا اور بالآخر وہ دن بھی آئے گا جب انسان خود اپنا خدا ہوگا مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو حیات وممات کے تمام سربستہ راز معلوم ہوں اور وہ تجربہ گاہ حیات میں تخلیق کی صلاحیت حاصل کرلے۔انسان تخلیق کے امر پر قادر ہوجائے گا یہی آج کی سائنس کی نقطہ منتہا ہے۔اس لیے آج کا سائنس دان تجربہ گاہ میں زندگی کی تخلیق کو جس معیار کی

اولیت دے رہا ہے وہ کسی دیگر امر کو حاصل نہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آج کی دنیا میں اگر اُسے خدائی کا دعویٰ کرنا ہے تو اسے یہ سنگ میل عبور کرنا ہی ہوگا اور اس کے بعد انسان اور کسی اَن دیکھے خدا میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جائے گا اور انسان کو اپنے سوا کسی کے روبرو جھکنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ جدید مغربی دنیا آج جن روحانی امراض میں مبتلا ہے اُن میں یہ مرض سب سے زیادہ خطرناک ہے۔اور اُن کے اس جنون نے انسان کی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے انسانیت کو افتراق وانتشار میں جھونک دیا ہے، زندگی میں امن وسکون اور اطمینان باقی ہے نہ حسن ودلکشی۔

چنانچہ مغرب کے یہ سب پست تخیل اور آخری حد تک پھیلا ہوا اخلاقی بگاڑ اُس کو کسی منزل کی طرف نہیں لے جائے گا۔ بلکہ وہ جس دلدل میں اتر چکا ہے وہ آگے جا کر مزید گہری ہو جائے گی۔ یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ ہم نے ایک ارب سے زائد بت پرستوں اور دوارب کے قریب ملحدین کا تذکرہ نہیں کیا تو انھیں معلوم ہو کہ زندگی کا جو طریق اِن لوگوں نے اپنایا وہ اہل مغرب سے چنداں مختلف نہیں۔ خالق کے وجود سے انکار یا خالق کے احکامات سے انکار ایک ہی قبیل سے ہیں۔ چنانچہ گمراہی اور اخلاقی پستی میں ہندو اور کیمونسٹ اہل نصاریٰ سے کئی قدم آگے ہیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ مغرب دراصل ایک استعارہ ہے اور اس دائرہ میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو خود کو سیکولر کہتے ہیں۔

چونکہ نظریات جغرافیائی سرحدوں کے پابند نہیں ہوتے اس لیے مشرق ہو یا مغرب انسانوں کا جو بھی گروہ سیکولر نظریات کا حامی ہوگا وہ گمراہ تصور ہوگا اور اُسے اہل مغرب ہی کہا جائے گا۔ چنانچہ اِن گمراہ قوموں کے سامنے اب صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اسلام کے دامنِ عافیت میں پناہ حاصل کرلیں۔ کیونکہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ قدیم زمانوں میں اول اول انسانی حماقت بت پرستی کی صورت ظاہر ہوئی اب سائنس کو خدا مان کر پھر سے اُسی جاہلیت کا اعادہَ کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جب تک قدیم اور جدید خرافات سے خود کو آزاد نہ کرلے

تب تک اسے حقیقی آزادی نصیب نہیں ہوسکتی۔اسلام ہمیشہ سے زخمی روحوں پر مرہم رکھتا چلا آیا ہے۔آج بھی اسلام کا دامن وا ہے اور مغرب کو اس ضمن میں کسی رکاوٹ کا بھی سامنا نہیں اس لیے کہ وہ ایک غالب قوم ہیں اسلام ہی سائنس اور مذہب کی اس مزعومہ کشمکش کو مصالحت میں بدل سکتا ہے۔

اسلام ہی انسانیت کے شرف کی بحالی کے لیے آخری جائے پناہ ہے، اسلام ہی امید کی واحد کرن ہے، اسلام ہی اس مصیبت زدہ دنیا کی امن وسلامتی کو بحال کرسکتا ہے جو مغرب کی حماقتوں کے طفیل انسان سے چھن چکی ہے۔بے خدا مغرب کی تباہ کاریوں سے نجات کے لیے قانونِ خداوندی کی اطاعت کے سوااب کو چارۂ کار نہیں۔اسلام انسان کو زندگی گزارنے کا ایک صحت مند پروگرام فراہم کرتا ہے۔اسلام انسان پر اس امر کو واضح کرتا ہے کہ دنیا میں تجھے جو علمی مادی اور روحانی کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں وہ دراصل تمھارے رب ورحیم کا فضل وکرم ہیں۔اسلام انسان کو یہ پیغام دیتا ہے کہ اپنی کامرانیوں کو تم ابنائے نوع کی خدمت کا ذریعہ بناؤ گے تو تمھارا خالق تم سے خوش ہوگا اور تمھیں انعام سے نوازے گا۔

یاد رہے کہ تمھارا رب حصول علم کی لگن یا اسرارِ فطرت کی جستجو سے غضبناک نہیں ہوتا کیونکہ خالق کو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اُس کی مخلوق میں سے کوئی اپنے علم کی بنا پر اُس کی خدائی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے بلکہ خالق کا غضب صرف اُس وقت بھڑکتا ہے جب انسان اپنے علم و فضل اور سائنسی معلومات کو ابنائے نوع کی بربادی کا ذریعہ بنالے۔اسلام کا دامن عافیت ہر اُس انسان کو سلامتی اور امن کی دعوت دیتا ہے جس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت موجود ہو چنانچہ خدا کرے کہ اہل مغرب بھی عصبیت وتعصب کے اندھے غاروں سے باہر نکلیں اور کھلے دل سے سچائی کا اعتراف کریں اُن کے سامنے کامیابی کی یہ واحد صورت ہے ورنہ انھوں نے جس تصور کامیابی کو اپنایا ہوا ہے خود اُن کے اندر سے اب اس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔

حقیقی کامیابی صرف خالق کے سامنے سر جھکانے میں ہے اور ناکامی خالق سے بغاوت کا نام

ہے۔

✡ ✡ ✡

نظریاتی تقابل، ایک مطالعہ

ان صفحات میں ہم نے مختلف علمی نظریات پر بحث کی ہے، قبل اس کے کہ ہم اسلام کے علم تصور پر بحث کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منحرفین کے گروہ جن نظریات پر آنکھیں بند کیے حیات کیے جارہے ہیں اُن پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال لی جائے تا کہ ان نظریات کی کمزوریاں کجیاں اور کوتاہیاں ہمارے سامنے آسکیں اور شاید خدا کا کوئی بندہ اس سے ہدایت حاصل کرے۔ سب سے پہلے ہم ڈارون اور اس کے نظریہ حیات کو لیتے ہیں۔ وہ 1808ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ ڈارون کا بچپن مذہبی لوگوں کے سائے میں بسر ہوا۔ جامعہ کیمبرج سے اُس نے دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ اس ڈگری کو حاصل کرنے کے بعد اُسے پادری بننا تھا مگر اُسے ایک سائنسی تحقیقاتی ادارے میں نوکری مل گئی جو لوگوں کی چھوٹی موٹی مہمات کو سائنسی تحقیق کے لیے روانہ کیا کرتے تھے۔ ڈارون جب اپنی پہلی سائنسی تحقیق پہ روانہ ہوا تو وہ چوبیس سال کا ایک مذہبی نوجوان تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت بیگل نامی بحری جہاز سے روانہ ہوا تو عام لوگوں کی طرح انسانی ارتقاء کے بارے میں اس کا نظریہ بھی

یہی تھا کہ ہر جاندار کو انفرادی اور خاص طور پہ خالق نے اپنے امر سے بنایا ہے۔ تین سال بعد جب ڈارون جنوبی امریکہ کے ساحلوں سے ہوتا ہوا ایکوڈور کے راستے انگلستان میں داخل ہوا تو وہ ملحد ہو چکا تھا اور حیات کے ارتقاء کے بارے میں اس کے خیالات بدل چکے تھے۔ تاہم فوری طور پہ ڈارون نے اس کا اظہار نہ کیا کہ اُس کا معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ تھا وہ اپنے خیالات کو مرتب کرتا رہا۔ آخر جب اُس کی عمر 48 سال کی ہوئی تو 1859ء میں اُس نے اپنی کتاب (The Origin of Species) شائع کر دی۔ جس میں اُس نے انسانی ارتقاء کا وہ نظریہ پیش کیا جس نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا حالانکہ وہ نظریہ شرفِ انسانیت سے پست اور تمام تر عقلی معیار سے گرا ہوا تھا۔ مگر اہل مغرب جو اپنی زندگیوں سے مذہب کو خیر باد کہہ چکے تھے شاید ایسے ہی کسی نظریہ حیات کے منتظر تھے جو اُن کو اللہ رب العالمین کی غلامی سے بھی نجات دلا دے۔ اس نظریے کو عقلی قرار دیا جاتا ہے مگر عقل سے اُس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

اس لیے ہم پہلے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو پیش کریں گے اس کے بعد اُس پہ عقلی حوالوں سے تنقید کریں گے حالانکہ بہ حیثیت ایک مسلمان ہمیں اس کی ضرورت نہیں اس لیے کہ قرآن حکیم میں انسان کے نظریہ حیات اور ارتقاء کے تمام تر مراحل کو تفصیلاً بیان کر دیا گیا ہے۔ مگر ہم مسلمانوں میں سے بھی ایک طبقہ ہر اُس تخیل کو آسمانی صحیفہ قرار دینے پہ مصر ہے جو مغرب سے آیا ہو۔ اس لیے ہم نے مناسب جانا کہ ڈارون کے نظریہ ارتقائے حیات کا ایک عقلی جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ جن کی عقلوں میں خلجان اور رویوں میں کجی ہے شاید اُن کے لیے ہدایت کا کوئی سامان ہو سکے۔ سادے لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ ڈارون نے انسان کو بندر کی ترقی یافتہ شکل بتایا ہے۔ یہ بات درست ہے اس لیے کہ گہرائی میں جا کر بھی ڈارون کے نظریہ حیات سے یہی بات سامنے آتی ہے۔ تاہم علمی نقطہ سے اگر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو بیان کیا جائے تو اس کی اہم کڑیاں یہ ہیں۔

☜ جانوروں میں توالد و تناسل کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اگر اُن کی نسلوں کا بہت بڑا حصہ

مسلسل ختم نہ ہوتا رہے تو اُن کی تعداد نا قابل برداشت حد تک بڑھ جائے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ رہائشی علاقوں کی محدود وسعت، خوارک کی محدود مقدار اور اس بے تحاشا بڑھتی ہوئی رفتار تولید کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جانوروں میں جہد للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTANCE) کا عمل رونما ہو۔ کشمکش حیات یہی بقاء اصلح (SURVIVAL OF FITTAST) کا باعث بنا کرتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک ہی نوع کے جانوروں کے انفرادی جسموں کی ساخت میں قدرے اختلاف (INDIVIDUAL DIFFEREANCE) ہوا کرتا ہے۔ یہ اختلاف نسلوں میں خفیف لیکن مسلسل ردو بدل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ردو بدل اکثر موروثی بھی ہوا کرتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جہد للبقاء کی مسلسل کشمکش سے اعضاء حیوانی میں جو خفیف ردو بدل پیدا ہوتا ہے اگر وہ مفید حال ثابت ہو تو نسل حیوانی کے بقاء واستحکام کا باعث بنتا ہے اور اگر مضر ثابت ہو تو یہی ردو بدل ماحول کی سازگاری میں اضافہ کر کے نسل کی فنا کا باعث بن جاتا ہے۔ جس طرح جہد للبقاء کی کشمکش میں وہی حیوانی نسلیں باقی رہتی ہیں جو مفید ردو بدل کے مسلسل قدرتی انتخاب (NATURAL SELECTION) کی

حامل ہیں۔مفید ردو بدل کا مسلسل اجتماع ہی باقی رہنے والی نسلوں میں عمل ارتقاء(EVOLUTION)کا سبب بنتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ ارتقائی منازل طے کرنے کا یہ عمل نہایت سست رفتار ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا مگر یہ عمل نباتات اور حیوانات کی ہر نوع (SPECIES)اور قسم(GENUS)میں قرن ہا قرن سے جاری چلا آتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ حیوانوں کے انواع واقسام کی اکثر کڑیاں اس قدر مسلسل اور مربوط نظر آتی ہیں کہ ایک نوع دوسری نوع کی ارتقائی شکل معلوم ہوتی ہے اور یہ تسلسل اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ انسان بن مانس اور بندر کی ارتقائی شکل ہے اور اس پوری ارتقائی لڑی کی ابتدائی کڑی کوئی واحد خلیہ(CELL)والا کرم حقیر ہوگا۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون کے نظریہ ارتقاء میں اہل علم کے لیے کوئی جدت نہ تھی۔جدت صرف اس بات میں تھی کہ سالہا سال کی تحقیق کے بعد اسے باضابطہ دلائل کے ساتھ سائنس بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ورنہ ارتقائے حیات کا خیال قدیم یونانی فلاسفہ کے زمانہ ہی سے چلا آتا ہے۔ چنانچہ ہیراکلیتس (HERACLITUS)نے حضرت مسیح کی پیدائش سے بھی پانچ سو سال پہلے یہ خیال پیش کیا تھا کہ حیات کی مختلف شکلوں سمیت کائنات کی ہر شئے تبدیل ہو رہی ہے۔ہیراکلیتس کے پچاس سال

بعد ایک اور یونانی مفکر ایمپی ڈولکز (EMPEDOCLES) نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ حیات جمادات سے پیدا ہوئی ہے اور حیوانات نباتات سے نکلے ہیں۔ تاہم یہ سب تخیل قیاساتِ محض تھے اور انسان کی اس آرزو کی پیداوار تھے کہ وہ ہر پیچیدہ مسئلے کو سادہ اور آسان فہم دیکھنا چاہتا تھا۔ اِن نظریات کے پیچھے کوئی عقلی دلیل موجود نہ تھی۔

مغرب کے جدید فلاسفہ اور سائنس دانوں کی جدت یہ تھی کہ انھوں نے اس انسانی آرزو کو حقیقت ثابت کرنے کے لیے دلائل کی جستجو کی۔ شواہد کا کھوج اٹھایا اور منطقی ثبوت فراہم کرنے کی سعی کی۔ تب مغرب کے دماغ پر زندگی کی مکینیکل تشریح کا بھوت سوار تھا۔ بلکہ ایک زمانہ تک تو وہ کائنات کو بھی ایک بڑی مشین ہی قرار دیتے رہے۔ چنانچہ کائنات کے بعد اب وہ حیات کی میکانی تشریح کے خواہش مند تھے۔ اُن کی اس خواہش کو ڈارون نے بھرپور انداز سے پورا کیا۔ تھامس ہسکلے نے ڈارون کے نقطہ نظر کی تائید کی اور اسے آگے بڑھایا۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ڈارون کی خرافات کے خلاف گہرا تحقیقی مطالعہ تھا جس کو مذہب کے حوالے سے آسٹریا کے ایک گوشہ نشین راہب گریگور منڈل (Gregor Mendel) نے پیش کیا۔

ڈارون کی کتاب (The Origin of Species) چھپنے سے پہلے ڈارون علمی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکا تھا اس لیے جب اُس کی کتاب چھپی تو اُس کی علمیت پہ ہر طرف سے تعریف کے ڈونگرے برسائے جانے لگے۔ دوسری طرف گریگور منڈل ایک گمنام راہب تھا جس کی سماج میں کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔ اس لیے گریگور منڈل نے جب ڈارون کی کتاب (The Origin of Species) پہ نقد لکھا تو کوئی اسے چھاپنے کو بھی تیار نہ تھا۔ آخر ایک غیر معروف سائنسی رسالے نے گریگور منڈل کی تحقیق توریث (GENETICS) شائع کر ہی دی۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس رسالہ نے گریگور منڈل کی تحقیق کو شائع کیا وہ خسارے میں تھا اور بند ہوا چاہتا تھا۔ جس شمارے میں گریگور منڈل کی تحقیق چھپی وہ بھی تقسیم نہ ہو سکا بلکہ اُس میراث کی طرح پڑا رہا جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ پچاس سال گزر گئے۔ لوگوں نے بڑی خوشی سے ڈارون کے نظریہ حیات کو

قبول کر لیا تھا۔ آخر پچاس سال بعد کسی صاحب علم کی نظر سے گریگور منڈل کی وہ تحقیق گزری تو اُس نے اسے دوبارہ سے چھاپنے کا عزم کیا۔ گریگور منڈل کی تحقیق سامنے آتے ہی ڈارون کے علمی غبارے سے ساری ہوا نکل گئی۔ اس لیے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقائے حیات میں پہلے ہی کوئی عقلی اساس موجود نہ تھی۔ اب ہم گریگور منڈل کی تحقیق کو ایک طرف رکھتے ہوئے ڈارون کے نظریہ حیات کا عقلی جائزہ لینے کی سعی کریں گے۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون نے کہا کہ:

جانوروں میں توالد و تناسل کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اگر اُن کی نسلوں کا بہت بڑا حصہ مسلسل ختم نہ ہوتا رہے تو اُن کی تعداد نا قابل برداشت حد تک بڑھ جائے۔

جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ!

دراصل تو یہ ڈارون کا اپنا تخیل ہے ہی نہیں بلکہ ایک چوری شدہ تخیل ہے جسے لوگ پہلے سے مالتھس (MATHUS) کے حوالے سے جانتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مالتھس نے کہا تھا کہ انسان اپنی آبادی کو کنٹرول کریں ورنہ ایک دن اُن کو خوراک اور رہائشی علاقوں کی قلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ڈارون نے اسے حیوانات تک وسعت دے دی۔ مگر اپنے اس تخیل کو سچ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی شہادت پیش نہیں کی کہ خالق کی بنائی ہوئی مخلوق میں سے کب کوئی مخلوق خوراک اور رہائش کی قلت کی وجہ سے نابود ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈارون کا یہ تخیل ایک علمی نظریے سے زیادہ کسی دیوانے کی بڑ نظر آتی ہے جو خالق سے بے زار ہو۔ ورنہ دیکھیں کہ سٹارفش ایک سیزن میں تیس لاکھ انڈے دیتی ہے اگر ہر سٹارفش کے تیس لاکھ انڈے مچھلیوں میں بدل جائیں تو اگلے روز سمندروں سے پانی ختم ہو جائے اور ہر طرف صرف سٹارفش ہی نظر آئے مگر قدرت کے کاموں میں جو

حکمت ہے اُس میں دخل اندازی سے ایسے ہی بے وقوفانہ نظریات سامنے آتے ہیں جیسا کہ ڈارون صاحب نے فرمایا تھا۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون آگے جا کے کہتا ہے کہ!

رہائشی علاقوں کی محدود وسعت، خوارک کی محدود مقدار اور اس بے تحاشا بڑھتی ہوئی رفتار تولید کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جانوروں میں جہد للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTANCE) کا عمل رونما ہو۔ کشمکش حیات یہی بقاء اصلح (SURVIVAL OF FITTAST) کا باعث بنا کرتا ہے۔

جواب دعویٰ یہ ہے کہ!

ذی حیات اور اُس کی خوراک پر تھوڑا سا تامل اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ حیوانات ہی کی چند اقسام دوسرے حیوانات کی خوراک ہیں اور جو نسلیں خوراک بنتی ہیں اُن کی خوراک نباتات ہیں۔ آسانی سے سمجھ میں آنے والی مثال ہے کہ جنگل میں شیر کی نسبت ہرن بہت زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور شیر بہت کم اس لیے کہ شیر ہرن کو کھا جائے گا مگر شیر کی طبعی عمر تک جنگل کا کوئی باسی اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ چنانچہ یہ خالق کی تقسیم اور اُس کے اندازے ہیں جو سو فیصد درست ثابت ہوتے ہیں کہ اُس نے اِس کائنات کو کھیل تماشا نہیں بنایا بلکہ ایک سنجیدہ مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ خطہ ارض پہ نگاہ ڈالیں تو آپ کہیں گے کہ افریقی ممالک میں لوگ بھوک سے بھی مر جاتے ہیں مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ امریکہ اس قدر گندم پیدا کرتا ہے کہ ہر سال اُسے لاکھوں ٹن گندم سمندر میں پھینکنی پڑتی ہے کیونکہ وہ اس کی ضرورت سے زائد ہوتی ہے پس ثابت ہوا کہ خطہ ارض پہ انسانوں کے لیے خوراک کی کوئی کمی نہیں اور اگر اس زمین پہ انسان بھوک سے مرتے ہیں تو وہ کچھ دوسرے انسانی

گروہوں کی بے حسی کی وجہ سے مرتے ہیں نہ کہ خوراک کی کمی کی وجہ سے؟؟؟

جہاں تک ڈارون کے نظریہ (SURVIVAL OF FITTAST) کا تعلق ہے تو وہ بھی سراسر باطل ہے۔ اس لیے کہ بفرضِ محال اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قلت غذا کی بنا پہ جانور کبھی کبھار جہد للبقاء کی کشمکش میں مبتلا ہو کر بقائے اصلح کا باعث بنا کرتے ہیں تب بھی یہ امر بدستور غور طلب رہے گا کہ اس جہد للبقاء کی نوعیت کیا ہوگی۔ کیا وہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے تقاضوں پہ پورا اترے گی؟ حقائق اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ کیونکہ ڈارون کے جہد للبقاء کے تصور میں جاندار اپنی نسل بدل لیتے ہیں اپنی شکل بدل لیتے ہیں وہ کہتا ہے کہ ڈائنوسار پہلے مچھلی تھا جو ہزاروں سال کے تغیر سے بدل گیا۔ دوسری طرف اس بات کے بھی کوئی شواہد نہیں ملے کہ غذائی قلت کے باعث جانوروں کی باہمی کشمکش سے اُن کے حیوانی اعضاء میں کسی قسم کا تغیر آیا ہو۔
قلیل مقدار خوراک پر جانوروں میں جنگ اُن کی قدرتی توانائی کو اجاگر کرنے کا باعث تو بن سکتی ہے مگر اُن کے جسموں میں کسی قسم کی تبدیلی کا محرک نہیں ہو سکتی۔ قلت غذا کی صورت میں جانوروں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ طاقتور جانور کمزور جانوروں کو اپنی خوراک بنا لیں گے، کمزور انواع قلیل غذا کی صورت میں آپس میں لڑ مریں گے یا پھر بھوک سے ہلاک ہو جائیں گی۔ تاہم اِن تمام صورتوں میں گیدڑ نہ تو کبھی شیر بنا ہے اور نہ بکری کبھی بھینس بنی ہے۔ چنانچہ حیوانوں میں جسمانی تغیر کا کوئی تاریخی ثبوت ہمارے سامنے نہیں۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ حوادثِ زمانہ سے جانوروں کی بڑی تعداد اپنے علاقے کو چھوڑنے پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ نئے علاقے میں جا کر اُن کے جسم آب ہوا کے زیر اثر اُن کے جسم میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں مگر تب بھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ انھوں نے اپنی نسل بدل لی ہو۔ فرض کریں کہ قطب شمالی کے سفید برفانی ریچھ یا سرد ممالک کی گھنی اون والی پہاڑی بھیڑوں کو شدید گرمی والے علاقے میں منتقل کر دیا جائے تو ہونا تو یہ چاہیے کہ نئے ماحول کے تقاضوں کے مطابق آہستہ آہستہ اُن بھیڑوں کے جسم سے دبیز اون کم ہو جائے یا برفانی ریچھ کی چربی

کی تہہ بہہ نکلے۔مگر عام مشاہدہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ یہ جانور مر جاتے ہیں مگر اُن کے جسم میں کوئی تغیر درنہیں آتا۔تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جو بھیڑیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار ہزار سال پہلے چرائی تھیں وہ سرد علاقوں کی گھنی اون والی بھیڑیں تھیں۔آج چار ہزار سال بعد بھی اُن علاقوں میں بالکل ایسی ہی بھیڑیں پائی جاتی ہیں جیسی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھیں۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر چہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد بھیڑوں کی ہزار ہانسلیں گزر چکی ہیں مگر اُن میں نام کو بھی تغیر نہیں پایا گیا۔اور بغیر کسی تغیر کے یہ نسلیں پھلتی پھولتی رہیں۔چنانچہ ڈارون کے اس تخیل کو بھی بلا دریغ رد کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون مزید کہتا ہے کہ:

ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک ہی نوع کے جانوروں کے انفرادی جسموں کی ساخت میں قدرے اختلاف (INDIVIDUAL DIFFEREANCE) ہوا کرتا ہے۔یہ اختلاف نسلوں میں خفیف لیکن مسلسل ردو بدل کا نتیجہ ہوتا ہے۔یہ ردو بدل اکثر موروثی بھی ہوا کرتا ہے۔

جواب دعویٰ یہ ہے کہ:

انفرادی جسموں کی ساخت میں ردو بدل کے جن مشاہدات کا ڈارون نے سہارا لیا ہے اُن کی دو نوعتیں ہیں۔ایک تو یہ کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں کئی قسم کے اختلافات نظر آتے ہیں۔ایک بیٹا لمبا ہے تو دوسرا پست قد،ایک کا رنگ گورا ہے تو دوسرا سانولا یا پھر کالا ہے،ایک لڑکی کے بال کالے ہیں تو دوسری کے بھورے ہیں،ایک کی آنکھیں سیاہ ہیں تو دوسری کی نیلی،ایک کے بال گھنے ہیں تو دوسری کے چھدرے،مزید براں اُن میں چہرے مہرے کا فرق ہے،ہڈی کاٹھی کا فرق ہے،ڈیل ڈول کا فرق ہے۔اور یہ تمام افتراق بے شک موجود ہیں بلکہ اِن میں مزید اختلافات کی گنجائش بھی

موجود ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انھیں موروثی قرار دینا پرلے درجے کی بے علمی ہے۔ کوئی بھی سمجھدار آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اختلاف جہد للبقاء کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ رحم مادر میں دورانِ حمل کا ماحول تمام بچوں کے لیے یکساں ہوتا ہے اور یہ خیال کرنا کہ وہاں کسی کشمکش حیات کے نتیجہ میں ایک بچے کا رنگ گورا اور دوسرے کا کالا ہوگیا، ایک مہمل خیال ہے۔ خود ڈارون بھی اسے جہد للبقاء کہنے سے گریز کرے گا۔

جدید سائنس نے اب اِن عقدوں کو کھول دیا ہے اور اب انسان جانتا ہے کہ افراد میں اس طرح کے افتراق کے اسباب بالکل جداگانہ ہیں اور یہ کوئی موروثی امر نہیں ہے۔ جسمانی ساخت میں ردوبدل کے مشاہدہ کی دوسری صورت یہ ہے اور جس پہ دراصل ڈارون نے اپنے نظریہ کی عمارت کھڑی کی ہے وہ جانوروں میں افزائش نسل کے تجربات ہیں۔ ماہرین افزائش نسل اکثر گھوڑوں، مویشیوں اور مرغیوں کی ایسی بہترین نسلیں تیار کرتے رہتے ہیں جو مختلف خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں اور اُن کی یہ خصوصیات یقیناً موروثی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ماہرین افزائش نسل نے مرغیوں میں زیادہ انڈے دینے والی اور زیادہ گوشت دینے والی مرغیاں پیدا کی ہیں مگر ڈارون اس سے جو نتیجہ نکالتا ہے وہ بعید از قیاس ہے۔ یہ درست ہے کہ افزائش نسل سے کسی حیوان کی بہتر موروثی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے ملاپ سے حیوانوں کی اعلیٰ نسل پیدا کرنا ممکن ہے مگر یہ ردو بدل کبھی بھی اس قدر بسیط نہیں ہوسکتا کہ مرغی بکری بن جائے یا بندر گھوڑا بن جائے۔

ڈارون مزید کہتا ہے کہ:

ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جہد للبقاء کی مسلسل کشمکش سے اعضاء حیوانی میں جو خفیف ردو بدل پیدا ہوتا ہے اگر وہ مفید حال ثابت ہو تو نسل حیوانی کے بقاء واستحکام کا باعث بنتا ہے۔ اور اگر مضر ثابت ہو تو یہی ردو بدل ماحول کی سازگاری میں اضافہ کرکے نسل کی فنا کا باعث بن جاتا ہے۔ جس طرح جہد للبقاء کی کشمکش میں وہی حیوانی نسلیں باقی رہتی ہیں جو مفید ردو بدل کے مسلسل

قدرتی انتخاب (NATURAL SELECTION) کی حامل ہیں۔مفید ردو بدل کا مسلسل اجتماع ہی باقی رہنے والی نسلوں میں عمل ارتقاء (EVOLUTION) کا سبب بنتا ہے۔ارتقائی منازل طے کرنے کا یہ عمل نہایت سست رفتار ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا مگر یہ عمل نباتات اور حیوانات کی ہر نوع (SPECIES) اور قسم (GENUS) میں قرن ہا قرن سے جاری چلا آتا ہے۔

جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ:
آج کی جدید سائنس نے اب بہت سے رازوں سے پردے اٹھا دیئے ہیں اور ڈارون کے علم کا بھانڈا بھرے چوک میں پھوڑ دیا ہے۔آج انسان جانتا ہے کہ ذی حیات افراد کے ہر خلیہ(LIFE CELL) میں خاص قسم کے باریک ذرات ہوتے ہیں جنھیں کرومو ثوم (CHROMOSOME) کہا جاتا ہے۔اگر چہ قدرت نے ہر نوع حیوانی کے لیے کروموثوم کی تعداد مختلف مقرر کی ہے مگر بہر حال حیات کی بنیاد کروکوثوم ہی پہ رکھی ہے۔حضرت انسان کے ہر خلیہ میں کروموثوم کے تئیس جوڑے ہوتے ہیں۔خواہ وہ انسان یورپ کا نام نہاد مہذب شہری ہو یا افریقہ کا وحشی سیاہ فام، زرد چینی ہو یا سرخ انڈین۔ہر ایک متنفس کے ہر حیاتی خلیے میں باریک دھاگوں کی صورت کروموثوم کی تئیس جوڑیاں موجود ہوتی ہیں اور انھی کروموثوم کی بدولت موروثی صفات اگلی نسلوں تک منتقل ہوتی ہیں۔یہی کروثوم حیات ہے اور یہی حیات کی منتقلی کا سبب بھی ہیں۔حیوانی خلیے تقسیم کے ذریعے بڑھتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے بچے کی نشو ونما ہوتی ہے۔تمام عمر قدیم خلیے مرتے رہتے ہیں اور اُن کی جگہ جدید خلیے جنم لیتے رہتے ہیں۔نو عمری میں نئے خلیوں کی پیدائش کی رفتار تیز ہوتی ہے اور قدیم خلیوں کی موت کی تعداد کم ہوتی ہے۔جوانی میں مرنے والے خلیوں اور نئے پیدا ہونے والے خلیوں کی تعداد متوازن ہو جاتی ہے جبکہ بڑھاپے میں مرنے والے خلیے پیدا ہونے والے خلیوں سے تعداد میں بہت بڑھ جاتے ہیں۔جب ایک خلیہ تقسیم ہو کر دو بنتا ہے تو تقسیم

سے پہلے کروموثوم عمل طباعت سے اپنے مثنیٰ تیار کرتے ہیں۔اس طرح دونوں خلیوں میں تیئس تیئس کروموثوم کے جوڑے موجود رہتے ہیں ۔ جب نر اور مادہ کے ملاپ سے حمل قرار پاتا ہے تو نر کا جرثومہ تیئس کروموثوم لاتا ہے یاد رہے کہ وہ تیئس کروموثوم کا جوڑا نہیں لاتا بلکہ اکہرے تیئس کرومو ثوم لاتا ہے۔عورت کے بیضہ سے اُسے مزید تیئس کروموثوم ملتے ہیں اس طرح نر کروموثوم کو جوڑا مل جاتا ہے۔اِن دونوں کروموثوم کے ملاپ سے نیا خلیہ بنتا ہےاور وہی نئی زندگی ہے۔

کروموثوم (CHROMOSOME) درحقیقت باریک ذرات کی ایک تسبیح ہوتی ہے جس کے ہر دانے کو جین (GENE) کہا جاتا ہے۔ ہر کروموثوم میں دانوں کی جوڑی ہوتی ہے۔اور ہر تسبیح میں جینز کے تقریباً تین تین ہزار دانے ہوا کرتے ہیں۔اس تسبیح کا ہر دانہ ایک مخصوص خصوصیت کا حامل اور امین ہوا کرتا ہے۔اور اسی مخصوص جین کے ذریعے ہی وہ اپنی مخصوص وراثت کو آگے منتقل کرتا ہے۔یا یوں کہہ لیں کہ اس تسبیح کا ہر دانہ یعنی ہر جین انسان کے نوشتہ تقدیر کا پروانہ ہے اور اس کے ہر دانے پر وہ موروثی مقدرات ثبت ہیں جو اُس نے اپنی اگلی نسل کو منتقل کرنے ہیں۔تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ موروثی خواص میں اُس وقت تک کوئی تبدیلی ممکن نہیں جب تک اس جینز کی اس تسبیح کو کوئی غیر معمولی حادثہ پیش نہ آئے۔اپنے معاشروں میں ہم جو نامکمل یا معذور بچے دیکھتے ہیں اُن کی معذوری کی وجہ جینز کی اس تسبیح کو غیر معمولی طور پہ پیش آنے والا کوئی حادثہ ہوتا ہے۔

چنانچہ قانون وراثت کے اِن جدید انکشافات نے ڈارون کے اس نظریہ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ ڈارون نے جو محل اس بنا پہ تعمیر کیا تھا کہ ماحول سے بہتر ہم آہنگی کے تقاضے کے مدنظر حیوانی اعضاء اپنے اندر ردوبدل کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور یہ مسلسل نسلوں میں چلنے والا سست رفتار عمل نسل در نسل خفیف تبدیلیاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔قانون توریث کی جدید تحقیق نے ڈارون کے اس خیال کو رد کر دیا۔ماہرین نے اس ضمن میں انسانی جین پہ ریڈیائی انتشار کا مطالعہ بھی کیا ہے جس سے جینز میں خفیف تبدیلیاں پیدا ہونے کا امکان موجود ہے۔ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو بچانے والی چند قوتیں فضائے بسیط کے کسی ریڈیائی انتشار سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔مگر وہ دوسری جنگ عظیم میں ایٹم

بموں کے استعمال سے پیدا ہونے والے عظیم تر ریڈیائی انتشار سے کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہیں کر سکے۔اس ریڈیائی انتشار نے انسانی جینز میں جو تغیر پیدا کیا اور جس کو متاثرہ جینز نے اگلی نسلوں تک منتقل کیا وہ تمام تر منفی اثرات تھے اُن میں کسی قسم کی بھلائی دیکھنے میں نہیں آئی ۔ ہیروشیما اور ناگا ساکی پہ ایٹم بم گرائے جانے کے بعد ریڈیائی انتشار سے متاثر ہونے والوں کے جینز میں جس قدر تبدیلیاں پیدا ہوئیں وہ سب کی سب تخریبی تھیں۔لاکھوں متاثرہ انسانوں میں سے کسی ایک میں بھی کسی تعمیری تبدیلی کو رپورٹ نہیں کیا گیا۔ لٰہذا قدرتی انتخاب(NATURAL SELECTION)تو یہی ہوگا کہ غیر متاثرہ افراد کے مقابلے میں ایٹمی ریڈیائی اثر سے متاثر ہونے والی تمام نسلیں تباہ ہو جائیں اور قدیم غیر متاثرہ نسلیں باقی رہ جائیں اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جینز میں ریڈیائی اثر سے پیدا ہونے والی تمام تبدیلیاں تخریبی ہی ہوا کرتی ہیں اور کسی ارتقاء کے عمل کا باعث نہیں بن سکتیں۔قدرتی انتخاب کی تو نوبت ہی نہیں آتی اور قدرتی انتخاب کی کثرت و اجماع سے عمل ارتقاء کا وجود میں آنا ایک ایسی آرزو بن کے رہ جاتا ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گی۔چنانچہ جب انسانی جینز میں ردوبدل کا امکان ہی مفقود ہو گیا تو نسلاً بعد نسلاً اس کا جاری رہنے کا تخیل بھی زمین بوس ہو گیا اس لیے ڈارون کی لاعلمی پہ نوحہ کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون نے مزید کہا کہ:

حیوانوں کے انواع و اقسام کی اکثر کڑیاں اس قدر مسلسل اور مربوط نظر آتی ہیں کہ ایک نوع دوسری نوع کی ارتقائی شکل معلوم ہوتی ہے اور یہ تسلسل اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ انسان بن مانس اور بندر کی ارتقائی شکل ہے اور اس پوری ارتقائی لڑی کی ابتدائی کڑی کوئی واحد خلیہ(CELL)والا کرم حقیر ہوگا۔

✡✡✡✡✡✡

جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ:

یہ تکرار بے سود ہے جب وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا تو نوحہ گری سے کیا حاصل۔ نباتات اور حیوانات کی ہر نوع اور ہر قسم کے ارتقائی عمل کا جاری رہنا ایک بے بنیاد خیال ثابت ہوا۔ جس کی تائید میں نہ تو قابل توجہ عقلی دلائل ہیں اور نہ ہی تاریخ کے اوراق سے ڈارون کے نظریات کی حمایت میں کوئی ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت انسان کو بندر کی اولاد قرار دینا نہ صرف انسانیت کی توہین ہے بلکہ اس نظریہ میں اُس شرف کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے جس سے باری تعالیٰ نے انسان کو نوازا ہے۔ چنانچہ کسی ایک نوع کا دوسری نوع میں منتقل ہو جانے کی راہ میں قانون توریث (Genetic law) سد سکندری کی طرح کھڑا ہے جسے نہ توڑا جا سکتا ہے اور نہ عبور کیا جا سکتا ہے۔ مختلف حیوانی انواع کے کروموثوم اور جینز کی مختلف ساختیں اور مقداریں نباتاتی یا حیوانی انواع کی ایک دوسرے میں تبدیلی کو ناممکن قرار دے رہی ہیں اور کرمِک حقیر سے حضرت انسان تک کی ارتقائی اڑان کا سہانا خیال اب ایک سراب بن چکا ہے۔ (19*)

ڈارون ازم نے دنیا کی ایک مہیب آبادی کو آخرت میں کسی جواب دہی سے آزاد کر دیا جس سے اُن کے دامن روحانی مسرت اور اُن کے معاشرے حقیقی سکون سے محروم ہو گئے۔ اوپر درج کئے گئے مباحث میں اس امر کا التزام کیا گیا ہے کہ ڈارون کو اسی کی زبان میں جواب دیا جائے جس زبان کو وہ سمجھتا ہے حالانکہ اُس کے نظریے کو اہل مغرب کا اہل علم بھی رد کرنے کے درپے ہے مگر عام انسان کی زندگی میں اُس کے اثرات کو مٹانے کے لیے اُس حقیقی علم کی ضرورت ہے جسے اللہ نے انسان کی ہدایت کے لیے اتارا ہے اس لیے اب ہم ڈارون ازم پہ الہامیات کے حوالے سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھیں کہ قرآن عظیم و برتر کتاب ہے اور اسلام دین حق ہے۔ قرآن و سنت کی موجودگی میں کسی مسلمان کو حیات و کائنات کی کسی میکانی تشریح کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ خواہش۔ انسان کے اس پیچیدہ ترین مسئلے کے بارے میں مسلمانوں کے ہاں سرے سے کوئی ابہام ہی نہیں پایا جاتا

اس لیے مسلمان اس بات کو نہایت اطمینان سے بیان کر دیتا ہے کہ یہ کائنات میرے رب کی تخلیقی برتری کی دلیل ہے اور اس کائنات کی سب سے اہم مخلوق انسان ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کے زمین پہ اتارا ہے تا کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے گنتی کے چند روز خالق کی اطاعت میں گزارے اور ابدی جنتوں کی طرف روانہ ہو جائے۔ ذرا سا غور کرنے سے یہ بات کھل کے سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو انسان کے لیے مطیع کر دیا ہے۔ اللہ نے انسان کی شان کو بہت بلند کیا ہے کہ آخر وہ ربِ کائنات کا نائب ہے اور ربِ کائنات کے نائب کے رتبے کے کیا کہنے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ کسی وفادار کنیز کی طرح ہر لحہ اُس کی شان کے آگے جھکا جاتا ہے۔ دیکھیں کہ گلاب کا حسن اور خوشبو اللہ تعالیٰ نے گدھے کے لیے تو پیدا نہیں کی بلکہ یقیناً اسے اپنے نائب کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے پیدا کیا ہے۔ کسی حسینہ کی لہراتی زلفوں کے سائے سے سانپ اور شیر کو کیا مطلب یہ تو اللہ کے نائب کی دلجوئی ہے۔

برسات کے موتیوں کی رم جھم سے کوئی بکرا تو محفوظ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو خالق کی طرف سے اپنے نائب کو تحفہ ہے۔ نیلگوں اور بدلتے منظروں والے آسمان کی طرف کبھی کسی بیل نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ یہ حضرت انسان کے لیے غور کا مقام ہے کہ وہ اپنے خالق کی تخلیقی مہارت کا اعتراف کرے اور اُس کی پاکی بیان کرنے کے لیے اس کے آگے جھک جائے۔ طلوع سحر کا مبہوت کن منظر بھینسوں کو ذرا بھی متاثر نہیں کرتا کہ اُن کو وہ دل ہی عطا نہیں کیا گیا جو حسن کے ہر خیرہ کن منظر کے سامنے دھڑکنے کی ترتیب بھول جایا کرتا ہے یہ دل تو خالق نے صرف اپنے نائب کے سینے میں رکھا ہے۔ جب آسمانوں کی زینت ٹمٹماتے چراغوں کی صورت اللہ کے نائب کو جھانکتی ہے تو اُن شکر گزار اور جھکی کمر والے اطاعت شعار بندوں کو دیکھ کر انھیں رشک آتا ہے اور وہ خواہش کرتے ہیں کہ کبھی خالق اُن کی وفا بھی تو آزمائے۔ مگر خالق ہے کہ اُسے ہر دم اپنے نائب کی بہتری کی فکر رہتی ہے کہ آخر وہ اپنے نائب سے بے پناہ محبت بھی تو کرتا ہے۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب کو زمین پہ اتارنے سے پہلے ہی اس قدر بسیط اہتمام کیے جن پہ نظر ڈالنے سے انسان کا دل اس قدر نرم ہو جاتا

ہے کہ وہ اپنے رب کے احسانات کے آگے جھکا چلا جاتا ہے اور سر اٹھانے کو اُس کا من ہی نہیں کرتا۔ابھی اللہ کا خلیفہ زمین پہ نہیں اترا مگر اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا ٹھنڈی ہو جا وہ آنے والا ہے سمندروں سے کہا بہنے لگو میرا نائب آنے والا ہے، پھولوں سے کہا کِھل جاؤ میرا خلیفہ آنے والا ہے آسمانوں سے کہا سنور جاؤ تا کہ میرے خلیفہ کی آنکھیں تمھیں دیکھیں تو سکون پائیں، پہاڑوں سے کہا تھم جاؤ تا کہ زمین پہ میرے خلیفہ کا قدم نہ ڈولے، سورج سے کہا اپنی ڈیوٹی سنبھالو میرے خلیفہ کی آمد آمد ہے، زمین سے کہا طرح طرح کے میوہ جات اُگاؤ خبردار میرے خلیفہ کو طعام و دہن کی کوئی دِقت نہ ہو، دریاؤں سے کہا خیال رہے میرا خلیفہ تم پہ سوار ہو تو اُسے اپنے سینے پہ اٹھائے رکھنا نخلستانوں سے کہا خنک ہو جاؤ شاید میرے خلیفہ کی سواری تیرے دامن میں اترے، ہواؤں سے کہا سبک خرامی سے چلنا تا کہ میرے خلیفہ کو ناگوار نہ گزرے، خوشبوؤں سے کہا دامن گُل میں گھس جاؤ وہ تمہیں پا ہی لے گا آخر وہ میرا خلیفہ ہے، درختوں سے کہا ہر ہر ذائقے کے پھل اُگاؤ تا کہ میرا خلیفہ انھیں چکھے تو خالق کی ارفع شان کے آگے سر جھکا دے، زمین سے کہا مختلف رنگوں میں منقسم ہو جاؤ کہیں سفید کہیں سبز کہیں سرخ کہیں سلیٹی تا کہ تمہاری ایک ہی صورت کی یکسانیت میرے خلیفہ کے مزاج کو گراں نہ گزرے، چاند سے کہا اپنے حسن کے سارے رنگ میرے خلیفہ پہ عیاں کر دے تا کہ وہ بارِ خلافت آسانی سے اٹھا سکے، موسموں سے کہا بدلتے رہو میرا خلیفہ بہت نازک مزاج ہے دھنک سے کہا اپنے رنگ بکھیرتی رہا کرو میرا بہت خلیفہ حسن پسند ہے، چوپائیوں سے کہا دیکھو میں نے تمھیں اپنے خلیفہ کی خوراک بنایا ہے اس لیے خوشی خوشی اپنی جان میرے خلیفہ کے ذوق طبع کے لیے قربان کر دینا، بادلوں سے کہا کھل کے برسنا خبردار میرا خلیفہ تنگی محسوس نہ کرے، پرندوں سے کہا گیت گاؤ میرا خلیفہ حسن ساعت کے ذوق سے معمور ہے، آبشاروں سے کہا بہتی رہو تا کہ میرا خلیفہ تمھارے حسن کے لطیف احساس سے لطف اندوز ہو، زمین سے کہا سنو میرا خلیفہ ایک بیج ڈالے تو ستر دانے اگانا اور ہر پودے پر سو بالیاں اٹھانا تا کہ میرے خلیفہ کو شکر گذاری کے لیے وقت ملتا رہے، دن سے کہا اجالے بکھیر دو تا کہ میرا خلیفہ خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکے، رات

سے کہا خامشی کو اوڑھ لینا تاکہ میرا خلیفہ آرام سے نیند پوری کر سکے، بہاروں سے کہا اپنی شوخیوں سے میرے خلیفہ کا دل بہلانا، جگنو سے کہا میرے خلیفہ کو ہنساؤ، شفق سے کہا میرے خلیفہ کے شوق دید کو ذرا ٹھہر، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کو زمین پہ اتارنے کا عزم کیا تو سب فرشتوں سے کہا میرے خلیفہ کو سلامی دو اور سارے فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ خدا غارت کرے ڈارون کو اُس نے اتنی عظمتوں والے اللہ کے اس نائب کو بندر کی اولاد بنا دیا۔ ڈارون کے مقابل اسلام نے انسان کو کس قدر رفعت عطا کی ہے یہی اسلام کا نظریہ ارتقاء ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے انکار نے مغربی معاشروں کو اخلاقی پستی کے اُس زنداں میں ڈال دیا جہاں انسان کی اخلاقی حیثیت کتے اور سور سے زیادہ نہیں رہی۔ قرآن حکیم میں تفصیل سے آدم کی ابتداء اور انتہا کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

ارشاد ہوا کہ:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّىٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا

اِلَّا اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

(القرآن الحکیم سورۃ البقرۃ 2 /30-39)

ترجمہ:

”پھر ذرا اُس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔انھوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کومقرر کرنے والے ہیں جو اُس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمھارا خیال صحیح ہے تو ذرا اِن چیزوں کے نام تو بتاؤ؟

انھوں نے عرض کی:

نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا:

تم انھیں اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب آدم نے اُن کو سب چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں،

جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اُسے بھی میں جانتا ہوں۔

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا۔

وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔

پھر ہم نے آدم سے کہا:

تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو وہ کھاؤ مگر اس درخت کا رُخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو جاؤ گے۔

آخر شیطان نے اُن دونوں کو اِس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اُس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ پہلے تھے۔

ہم نے حکم دیا کہ:

اب تم یہاں سے اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔

اُس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کر لی جس کو اُس کے رب نے

قبول کرلیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

ہم نے کہا کہ:

تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لیے کسی رنج و خوف کا کوئی موقع نہ ہوگا اور جو اُس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

✡ ✡ ✡

فرائیڈ کے شیطانی افکار

اہل مغرب نے مذہب کو خیر باد کہا تو ساتھ ہی وہ قدیم اخلاقی روایات سے بھی انکاری ہو گئے۔ ابھی چند صدیاں پہلے مغرب کا معاشرہ ایسے ہی تھا جیسا کہ کوئی مذہبی معاشرہ ہو سکتا ہے جو اخلاقی روایات کی پوری پاسداری کرتا ہو۔ تب مغرب میں بھی ماں بہن کی اُسی طرح تکریم کی جاتی تھی جس طرح کہ مشرق میں کی جاتی ہے۔ مغرب میں جو انقلاب آیا وہ انقلاب کلیسا کے جبر کے خلاف ایک بڑی مزاحمت تھی مگر جب معاشرہ سیکولر ہو گیا تو اُن کا دامن اخلاقی روایات سے بھی تہی ہو گیا۔ مغرب کے معاشروں کی یہ تبدیلی تدریجاً رونما ہوئی۔ ڈارون نے جب اُن سے کہا کہ انسان یونہی بس اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا اور بندر سے ترقی کرتا ہوا موجودہ شکل تک پہنچا ہے اور انسان کا کوئی خالق نہیں تو مذہب بیزار معاشرے نے عافیت کی سانس لی۔ اور جب ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ (SIGMUND FRUD) نے اُن کو آزاد شہوت رانی کی طرف بلایا تو انھوں نے اسے بغیر کسی ردوکد کے قبول کر لیا اور اُس پست اخلاقی رویے کو اپنا لیا جس کے بدترین مظاہر آج کے مغربی معاشروں کا عرف ہیں۔

سگمنڈ فرائیڈ قوم یہود سے تھا۔ وہ اگرچہ ملحد تھا اور کسی خالق کے وجود سے انکاری تھا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ایک کٹر یہودی بھی تھا اور یہودیت کے خلاف بات سننے کو تیار نہ تھا۔ وہ ایک آدم بیزار شخص تھا کہنے کو تو وہ ماہر نفسیات تھا مگر حقیقت میں وہ خود پاگل تھا اس لیے کہ انسانوں کو جس آزاد شہوت رانی کی طرف اُس نے بلایا تھا وہ تو کتوں اور سوروں کے سماج میں دیکھی جاتی ہے مگر حیرت ہے کہ مغرب نے اُسے اپنا لیا اور اخلاقی لحاظ سے وہ کتوں اور سور کے مماثل ہو گئے۔ فرائیڈ یہودیوں کے انھی خاندانوں میں شامل رہا ہو گا جو جلاوطنی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہودیوں کو اپنی قبیح عادات کی وجہ سے کبھی انگلستان سے نکالا گیا تو کبھی فرانس نے انھیں حکم دیا کہ وہ اِن کے ملک سے نکل جائیں اور اہل جرمن نے یہودیوں سے جو بدترین سلوک کیا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ چنانچہ جلاوطنی کی آگ میں جلتے مغضوب قوم بنی اسرائیل کی باقیات کے انھیں گھرانوں میں سے ایک غریب گھرانے میں آسٹریا کے ایک دور دراز گاؤں میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ 1856ء پیدا ہونے والے اس لڑکے کا نام فرائیڈ رکھا گیا۔ بنی اسرائیل کے افراد ایک بڑی تلخ حقیقت کا شکار ہیں۔ پیدا ہوتے ہی اُن کے کانوں میں جبری طور پہ اس تخیل کو انڈیل دیا جاتا ہے کہ وہ ایک برگزیدہ اور خدا کی پسندیدہ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک ایسی نسل جسے خدا تعالیٰ نے اپنی رحمتوں کے لیے مختص کر لیا ہے۔ اور اُن کا تعلق اس قوم سے ہے جن کو دوسری تمام اقوام پہ برتری عطا کی گئی ہے۔ تاہم جب وہ لڑکے شعور کی آنکھ کھولتے تو دیکھتے ہیں کہ جو کچھ اُن کے بزرگوں کہا تھا معاملہ تو اُس کے برعکس ہے۔ کسی برگزیدہ قوم سے تو اُن کا کیا تعلق ہو گا وہ تو اس دنیا کی عام اقوام سے بھی نہایت پست ہیں جنھیں نہ بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں اور نہ ہی اقوام عالم میں انھیں کسی حوالے سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی قوم ہیں جسے دنیا نے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنانے کے لیے چن لیا ہے۔ جب وہ اپنی تاریخ پہ نگاہ ڈالتے ہیں تو انھیں اور بھی ندامت ہوتی ہے کہ وہ صدیوں سے محروم، مغضوب اور مصائب سے دوچار چلے آئے ہیں۔ چنانچہ عقیدہ اور مشاہدہ کے اس بڑے تضاد نے اُن کی نئی نسل میں ایک طرف تو خدا سے مایوسی

اور لادینی رجحان کو اجاگر کیا تو دوسری طرف نسلی تعصب کو بھی جنم دیا۔ چنانچہ قوم بنی اسرائیل میں ایسے مفکر پیدا ہونے لگے جو ایک طرف تو خدا کے منکر تھے مگر ساتھ ہی وہ یہودیوں کے نسلی تعصب سے بھی پُر تھے۔ فرائیڈ انھی میں سے تھا۔ فرائیڈ کے نظریات اس قدر فحش اور مصنوعی اور لغو ہیں کہ انھیں زیر بحث لانے میں کراہت کا ایک عنصر موجود ہے مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ چین سے لے کر جاپان تک، بینکاک سے لے کر ہانگ کانگ تک، فرانس سے لے کر جرمنی تک، آسٹریا سے لے کر ڈنمارک تک، روس سے لے کر کیوبا تک، ہالینڈ سے لے کر فن لینڈ تک، کینڈا سے لے کر آسٹریلیا تک، سویزرلینڈ سے لے کر ناروے تک، اسپین سے لے کر بیلجیئم تک، اٹلی سے لے کر تھائی لینڈ تک، انگلستان سے لے کر امریکہ تک کتنے ہی ممالک ہیں کتنی ہی قومیں ہیں کتنے ہی معاشرے ہیں جنھوں نے فرائیڈ کے آزاد شہوت رانی کے تصور کو اپنا لیا ہے تو دل دہک سارہ جاتا ہے۔

دماغ میں سوال اٹھتا ہے کیا یہ لوگ پاگل ہیں؟

جواب آتا ہے کہ نہیں۔

کیونکہ علوم عالم میں اُن کا ڈنکا بج رہا ہے، ٹیکنالوجی میں انھوں نے ماعصر اقوام کو پیچھے چھوڑ دیا ہے معاشیات، عسکریات اور سیاسیات میں وہ دوسری قوموں سے ممتاز ہیں جس سے یہ بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ پاگل نہیں ہیں۔ تو اگر وہ پاگل نہیں ہیں تو اس جنسی دیوانگی کے پیچھے وہ کونسا ہے راز ہے جس کے پیچھے دنیا کی درجنوں اقوام سینکڑوں ممالک اور انگنت معاشرے پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ چونکہ وہ خود کو کسی قوت قاہرہ کے سامنے جوابدہ تصور نہیں کرتے اس لیے زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف کشید کرنے کے جنون میں مبتلا ہیں لیکن یہاں پھر وہی سوال موجود ہے کہ دنیا میں شہوت کے سوا بھی تو لذت کے بہت سے پہلو موجود ہیں جن کی طرف اِن اقوام اور معاشروں کا رجحان سرسری سا ہے۔ اِن اقوام میں صاحب دانش لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں

۔مگر شاید اُن کے صاحب دانش بھی اپنی قوم کی اس دیوانگی پہ تنقید نہیں کرتے۔کیا اُن کے اس رجحان کے پیچھے کوئی ایسا راز ہے جس سے دوسری اقوام لاعلم ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں جن معاشروں میں اخلاقی رویے مستحکم ہیں اور عورت اور مرد نکاح کے بعد خلوت میں جاتے ہیں اُن میں تو جنسی دیوانگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے مانا کہ شہوت انسان کا فطری جذبہ ہے، طاقتور جذبہ ہے مگر اس جذبے کو دنیا میں ہر جگہ تسکین حاصل ہو رہی ہے۔آزاد شہوت رانی کے اِن معاشروں میں جنسی جرائم بھی اُن علاقوں سے زیادہ ہیں جہاں اخلاقی اقدار کی پاسداری کی جاتی ہے۔سب سے زیادہ جنسی تشدد امریکہ میں ریکارڈ کیا گیا ہے حالانکہ وہاں آزاد شہوت رانی کا دستور ہے۔چنانچہ اس دیوانگی کے پیچھے یقیناً کسی خاص نظریے کی پیروی مقصود ہے جو انسان اخلاقی طور پہ کتے اور سور کے برابر اتر آیا ہے۔

مورخین نے لکھا ہے کہ فرائیڈ نے جنسی نفسیات کے جن حوالوں پہ بحث کی ہے اور جو نتائج نکالے ہیں اُن میں سے اکثر غلط ثابت ہو چکے ہیں مگر مغربی معاشرے آزاد شہوت رانی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ کوئی دلیل انھیں حیا کی طرف مائل نہیں کر سکتی کیونکہ حیا کا تعلق اُس اندرونی احساس سے ہے جو اُس کا معاشرہ اُس کا نظریہ حیات اُس میں پیدا کرتا ہے۔مغربی ممالک میں اکثریت عیسائی معاشروں کی ہے جو ایک الہامی دین تھا۔اُن کے دین نے انھیں کسی قسم کی آزاد شہوت رانی کی طرف نہیں بلایا بلکہ عمومی عرف کے مطابق نکاح کی دعوت دی ہے۔اخلاقی اقدار اور روز جزا کا خوف دلایا ہے۔مگر اِن مغربی ممالک کے عام باشندوں کا چلن روس کے ملحدین سے مشابہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ سوال کرنے پر امریکی یا برطانوی شہری کہے گا وہ کرسچن ہے اور رشین شہری کہے گا وہ کیمونسٹ ہے۔

کیمونسٹ سے تو اگلا سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں مگر کسی امریکی یا برطانوی شہری سے اگر دوسرا سوال کر ہی دیا جائے کہ اُن کے دین نے اُن کے لیے کیا ضابطہ اخلاق متعین کیا ہے تو اُن کا علم دین ختم ہو جائے گا اس لیے کہ نہ وہ اپنے دین کے بارے میں کچھ جانتے ہیں، نہ جاننا چاہتے ہیں اور نہ

ہی اُن کے پاس ایسی فضول باتوں کے لیے وقت ہے۔اس لیے اگر اہل مغرب کو ملحدین کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تو وہ اُن کا عمل ہے جس سے یہ دلیل فراہم ہوتی ہے کہ اُن میں اور ملحدین میں کوئی فرق نہیں۔فرائیڈ کا نظریہ حیات کیا تھا؟ اُس نے لوگوں کو کس بات کی طرف بلایا؟ اُس نے ایک انسانی جذبے کی اس قدر لغو تشریح کیوں کی؟ لوگوں کی کثیر تعداد نے فرائیڈ کے نظریے کو بغیر کسی تنقید و تحقیق کے کیوں اپنا لیا، انھی سوالوں کے جواب کھوجنے کے لیے ہمیں فرائیڈ کے نظریات سے براہ راست واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔

✡✡✡✡✡✡

فرائیڈ نے جب تعلیم مکمل کی تو یہودی ہونے کی وجہ سے کوئی اُسے منہ نہ لگاتا تھا۔خود فرائیڈ بھی نہایت بدمزاج اور آدم بیزار تھا۔چند یہودیوں کے سوا اُس نے زندگی بھر اپنا کوئی دوست نہیں بنایا۔اُس نے اپنا شہر چھوڑ دیا اور کسی دور دراز قصبے میں ایک یہودی ڈاکٹر نے نسلی عصبیت کی بنا پر اُس کو اپنا نائب مقرر کر لیا۔نوجوان ڈاکٹر فرائیڈ یقیناً خود بھی زنا میں بری طرح ملوث رہا ہوگا۔اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ اُس کی دلچسپی اُن عورتوں میں تھی جو اپنے خاوند سے بے زار تھیں۔ہسٹریا کا مرض اُس کی دلچسپی کا موضوع تھا۔اُس کے پاس بہت سی عورتیں آتیں جو اپنے خاوند کے ظلم کا شکار ہوتیں۔اول اول تو فرائیڈ اُن کا علاج اُسی معروف طریقے سے کرتا رہا جو اُن دِنوں مروّج تھا تاہم بعد میں اُس نے اپنے طریقہ علاج کو بدل لیا۔

اُسے ہپناٹزم میں بھی کچھ مہارت تھی۔جب عورتیں تھکی ماندی اور اپنے خاندوں کے ظلم سے ہراساں اُس کے پاس آتیں تو وہ اُن کو ہپناٹائز کر لیتا اور اُن سے کہتا جو کچھ تمھارے دل میں ہے اُگل دو، وہ مریضوں سے بے تکلف ہو جاتا اور اُن سے اُن کی نجی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرتا

رہتا۔ اِن معلومات کو وہ ایک جگہ درج کرتا رہتا۔ اُس کے علاج سے عورتیں ٹھیک ہوجاتی تھیں۔ اُس کو علاقہ میں شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ اُس نے اپنے علاج کے طریقہ کار کا نام نفسیاتی تجزیہ (PSYCHO ANALYSIS) رکھا۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا مگر جب اُس کے نظریات لوگوں کے سامنے آئے تو وہ کچھ زیادہ پسندیدہ نہ تھے۔ یقیناً اُن کے خلاف کلیسا اور مذہبی حلقوں نے آواز اٹھائی مگر تب کلیسا کا اثر اس حد تک کم ہو چکا تھا کہ لوگوں کے دل میں اب اُس کا کوئی وقار نہ تھا اس لیے لوگ فرائیڈ کے نظریات سے متاثر ہونے لگے۔

✡✡✡✡✡✡

فرائیڈ نے کہا کہ؛

انسانی ذہن تین شعبوں میں منقسم ہے، لاشعور (UNCONCIOUS) ذہن کا سب سے بڑا شعبہ ہے جو تمام خواہشات کا نفسانی گھر ہے۔ انسان کی تمام آرزوں کا سرچشمہ جذبہ شہوت ہے۔ خوشی کا حصول انسان کا واحد مقصد ہے اور شہوت اُس کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ ذہن کا دوسرا شعبہ تحت الشعور (PRE-UNCONCIOUS) ہے۔ اور تیسرا شعبہ شعور (CONCIOUS) ہے۔ شعور کے شعبہ میں انسان خواس خمسہ کے تمام تاثرات وصول کرتا ہے جو تحت الشعور کے راستے لاشعور کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں۔ تمام جذبات، تمام خیالات تمام مشاہدات اور تمام یادیں لاشعور میں مدفون ہیں اور تحت الشعور کے جھرونکے سے گزر کر شعور کی سطح پر ابھر آتی ہیں۔ تحت الشعور میں تہذیب وتمدن، اخلاق وروحانیات کے تاثرات نے ایک محکمہ احتساب قائم کر رکھا ہے جو لاشعور سے ابھر کر تحت الشعور تک آنے والی خواہشات کی چھان بین کرتا ہے اور اُن میں سے مناسب خیالات اور آرزوں کو شعور کی سطح تک ابھر آنے کی اجازت دیتا ہے اور نامناسب خواہشات کو واپس لاشعور کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ مگر حیوانی

جذبات بھوکے شیر کی طرح انسان کے لاشعور میں بیٹھے مسلسل ہلچل مچا رہے ہوتے ہیں اور وہ شعور کی سطح تک ابھر کر عملی میدان میں جلوہ گر ہونا چاہتے ہیں۔لیکن تہذیب وعقل کا محتسب اُن کو ابھرنے کی اجازت نہیں دیتا۔تب یہ خواہشات محتسب سے بچنے کے لیے عجیب عجیب بہروپ بھرتی ہیں تاکہ وہ کسی طرح جلوہ آرا ہو پائیں۔اِن خواہشات کے انھی مچلتے بہروپوں سے خوابوں کی دنیا آباد ہوتی ہے۔فرائیڈ کہتا ہے کہ طنز و مزاح،خاندانی،قبائلی اور قومی توہمات رسم ورواج،ثقافت اور مذہبی عقائد اور عبادات تمام تر انھی پوشیدہ جذبوں کے مختلف بہروپ ہیں جنھیں تہذیب کا محتسب جلوہ گر ہونے سے روک لیتا ہے۔خیالات اور جذبات قانون اور اخلاق کے احتساب کی جانب سے بار بار لاشعور کی طرف دھتکارے جاتے ہیں۔اس مسلسل دباؤ کی وجہ سے یہ جذبات رفتہ رفتہ لاشعور کی گہرائیوں میں دب کر گرہ گیر ہوجاتے ہیں۔یادوں سے دور اور گہری تہوں کے نیچے مستور یہ جذبات جب اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں تو انسانی طبع میں الجھن اور کشمکش کے آثار واضح ہونے لگتے ہیں یہی کشمکش(CONFLICTS) بعد میں نفسیاتی عوارض(NEUROSES)اور ہسٹریا جیسے امراض کا باعث بنتے ہیں۔گویا ڈاکٹر فرائیڈ یہ کہنا چاہتا ہے کہ نفسیاتی بیماریاں گویا فطری جذبات کو غیر فطری احتساب کے ذریعے دبائے رکھنے کا ردعمل ہیں۔فطرت کو غیر فطری طور پہ دبانے کی سزا ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

☜ گے جا کے وہ کہتا ہے

خواب مدفون جذبات کے مظاہروں کے سوا اور کچھ نہیں ۔ یہ پوشیدہ آرزوں کے اعلانات ہیں جو احتساب کے خوابیدہ چوکیدار کو چکمہ دے کر تمثیلی زبان ،تصویری مرقعوں، اشاروں کنایوں اور پہیلیوں میں بے چین جذبات کی داستان بیان کرتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

☜ فرائیڈ کے نزدیک

محبت، نفرت، رحم، غضب، جرأت، خوف، حزن، وغیرہ اگرچہ انسانی جذبات کی متعدد شکلیں ہیں مگر اِن سب جذبات کا مصدر صرف ایک ہی بنیادی جذبہ ہے اور وہ ہے شہوت۔ یہ بنیادی جذبہ انسان کے نطفہ میں موجود ہوتا ہے، جنین کے ساتھ پرورش پاتا ہے اور بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اپنا مظاہرہ کرنے لگ جاتا ہے۔ پیدائش کے بعد بچہ کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ جنسی شہوت کے جذبہ میں سے ہی تمام انسانی جذبات نمودار ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ اعلیٰ مذہبی تخیلات اور بلند روحانی جذبات بھی دراصل اسی سفلی جذبہ کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ خوف وامید و جلب منفعت کے جذبات جو انسانی عمل کے بنیادی محرکات سمجھے جاتے ہیں وہ بھی جنسی شہوت کے جذبہ ہی سے نمودار ہوتے ہیں۔ جنسی شہوت کا جذبہ بچے کی پیدائش کے وقت سے ہی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت بچہ اپنی ماں کی طرف راغب ہوتا ہے اور اُس سے ناجائز جنسی تعلق (INCEST) استوار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جنسی اعضاء کی عدم پختگی کی وجہ سے چونکہ بچہ ابھی جنسی اختلاط پہ قادر نہیں ہوسکتا اس لیے اس کی جنسی شہوت ماں سے محبت میں بدل جاتی ہے۔ بچہ جب باپ کو ماں کی طرف مائل دیکھتا ہے تو اُس کے اندر رقابت کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے اور وہ اپنے باپ سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ماں بیٹے اور باپ بیٹی میں ناجائز محبت اور باپ بیٹے اور ماں بیٹی میں رقابت کے اس جذبے کو ڈاکٹر فرائیڈ اپنی قابل فخر دریافت قرار دیتا ہے اور اپنی اس دریافت کا نام اُس نے (OEDIPUS COMPLEX) رکھا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ ائیڈ نے مزید کہا

چونکہ قدرت نے خود ہی انسان کو اِن سفلی اور مذموم جذبات کے چکر میں ڈالا ہے اس لیے اِن سے مفر ممکن نہیں۔ اخلاق و روحانیت کی درس و تدریس اور تہذیب و تمدن کی اصلاحی تحریکوں نے انسان کو اس فطری درندگی سے بلند تر کرنے کی انتھک کوششیں کی ہیں لیکن یہ تمام جدوجہد انسان میں موقتی انفعالی جذبہ پیدا کرنے سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکیں۔ اور یہ انفعالی جذبہ بھی مفید ثابت ہونے کی بجائے مضر ہی ثابت ہوا اور اِن انفعالی جذبات اور شہوت کے دباؤ کی آپسی کشمکش سے انسان مزید نفسیاتی عوارض کا شکار ہوا۔ لہٰذا مذہبی اور اخلاقی آئیڈیل محض ایسے خواب ہیں جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے بلکہ یہ محض عظیم تر مغالطے(GREAT ILLUSIONS) ہیں۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تاج شرف سے مزین کیا ہے۔ اور تاج شرف کیا ہے وہ عقل انسانی ہے جس نے انسان کو بھلے برے کی تمیز عطا کی ہے۔ آزاد جنسی شہوت کے نظریے کو کوئی بھی عقلی اساس فراہم نہیں کی گئی۔ انسانی کی شعوری تاریخ کے کسی بھی دور میں آزاد شہوت رانی کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ مغرب کا دانشور بھی اس کو ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتا ہے مگر مغربی معاشروں میں آزاد شہوت رانی کا چلن اس قدر پختگی اختیار کر چکا ہے کہ اب اسے وہاں سے مٹانا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ پتا نہیں وہ فرائیڈ کے نظریاتی پیروکار ہیں یا جنسی جنون کے بدحواس پاگل کہ انھوں نے تمام تر اخلاقی روایات کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ حالانکہ آزاد شہوت رانی نے مغرب کو کچھ بھی نہیں دیا سوائے ندامت اور پچھتاوے کے مگر یہ وہ آگ تھی جو بھڑک اٹھی تو بھڑکتی ہی رہی حتیٰ کہ اُس کے بد اثرات سے مغرب اب خاندان جیسے بنیادی سماجی ادارے سے ہاتھ دھو چکا ہے مگر اس کے باوجود اُن کے قانون ساز

ادارے ایسی قانون سازی کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں یہ آگ ابھی مزید بھڑکے گی۔فرائیڈ کے نظریات بے عقلی اور جاہلیت کے واضح نشانات لیے ہوئے ہیں۔فرائیڈ یقیناً خود ایک جنسی مریض تھا جس نے اپنے تخیلات کو نظریہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور دنیا کے جن لوگوں کے دلوں سے خالق کا خوف اُٹھ چکا تھا انھوں نے اسے اپنا لیا۔ حالانکہ آج کی دنیا میں بھی درجنوں معاشرے اور سینکڑوں ممالک موجود ہیں جن میں آزاد شہوت رانی کا کوئی تصور نہیں۔مسلمان تو خیر احکامات قرآن کا پابند ہے اور قرآن کی تعلیمات عین فطرت ہیں۔قرآن میں نکاح کو شہوت کی جائز راہ قرار دیا گیا ہے اور مرد کو نکاح میں آسانی فراہم کی ہے تاکہ وہ بدکاری سے بچ جائے۔ جہاں تک فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات کا تعلق ہے تو جدید انکشافات کی روشنی میں اُن کا جائزہ لینے سے فرائیڈ اچھا خاصا جاہل ثابت ہوتا ہے اور اُس کے غیر انسانی اور جنسی طور پہ بیمار تخیلات کو عقلمندوں نے کبھی بھی درخور اعتناء نہیں جانا۔فرائیڈ نے انسان کے ذہن کو جو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے تو یہ تقسیم سراسر ایک فرضی تقسیم تھی جس کا کوئی ثبوت آج کی جدید سائنس فراہم نہیں کر سکی۔فرائیڈ نے جو کچھ بھی کیا وہ اُس کے بیمار دماغ کا شاخسانہ تھا۔چنانچہ مشاہدات کی نوعیت، جذبات کی کیفیت اور لاشعور کی ماہیت کے متعلق جدید سائنس نے وافر معلومات فراہم کی ہیں جن کی روشنی میں فرائیڈ کے نظریات دیوانے کی بڑ نظر آتے ہیں۔چنانچہ آج ہم جانتے ہیں کہ شعور انسانی دماغ کے ایک عمل کا نام ہے نہ کہ دماغ کے کسی حصے کا۔

انسانی دماغ میں شعور یا لاشعور کی تقسیم لایعنی ہے۔انسانی دماغ مربوط شکل میں پیدا کیا گیا ہے۔اُس کے حصے بخرے فرائیڈ نے کیے۔مگر جدید سائنس نے فرائیڈ کی اس دھوکا دہی کا پردہ فاش کر دیا۔جدید تحقیق نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے اندر پیدا ہونے والے جذبات و احساسات دراصل چند مخصوص غدودوں میں موقتی کیمیائی عمل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔جذباتی غدودوں میں کیمیائی مادہ پیدا کرنے یا روک رکھنے کا مقام انسانی دماغ میں ایک مخصوص جگہ پہ پایا جاتا ہے۔یہ کنٹرول جبلی طور پہ کام کرتا ہے اور انسان کے مخصوص موقتی ماحول کی رعایت سے مخصوص

غدودوں میں کیمیائی عمل کو جاری کرتا اور روکتا ہے۔لیکن اِن کیمیاوی محرکاتِ جذبات کو پیدا کرنے والی غدودیں دماغ سے باہر ہیں اور وہ کیمیائی مادہ پیدا کرتی ہیں وہ بھی دورانِ خون میں مل کر جسم میں جذباتی کیفیت پیدا کرتا ہے۔وہ مادہ دماغ کی طرف نہیں جاتا جس سے یہ امر کھل کے سامنے آجاتا ہے کہ جذبات کا منبع انسانی دماغ نہیں بلکہ اُس کا جسم ہے۔ چنانچہ اس سے فرائیڈ کے اس مفروضے سے ہوا نکل جاتی ہے جس میں اُس نے کہا تھا کہ لاشعور میں موجود جذبات ہمہ وقتی ہلچل مچائے رکھتے ہیں۔اس کے برعکس جدید سائنس اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جذبات انسان کا شعوری عمل ہے اور اس کا لاشعور سے کوئی تعلق ہی نہیں آیئے اس معاملے میں مغربی محققین کی رائے سے آگاہی حاصل کریں۔مشہور امریکی ماہر نفسیات (Pro, Joseph Jastrow) اپنی کتاب (Freud His Dream and Sex Theories) میں لکھتے ہیں کہ:

''لاشعور فرائیڈ کے نظریات کا بنیادی مفروضہ ہے جس کے بغیر نفسیاتی تجزیہ کا وجود ناممکن ہے۔فرائیڈ کی پوری تحریک اسی پر چل رہی ہے۔ یہ ایک مفروضہ ہے جو بنیادی سوال کا بڑا ہی شاطرانہ جواب تھا۔لیکن چونکہ چند باتوں کی توجیہہ کے لیے ہمیں اس مفروضہ کی ضرورت ہے۔محض اس بنا پہ اس کا جواز پیدا نہیں ہوسکتا کہ ہم لاشعور کے وجود کو فرض کرلیں۔زمانہ قدیم میں ہسٹریا اور مماثل عوارض کی توجیہہ یوں کی جاتی تھی کہ مریض پہ ''جن'' قابض ہو گیا ہے۔اس پہ بھوت پریت کا سایہ ہے۔اگر آپ یہ فرض کرنے پہ آمادہ ہوں کہ جن بھوت ہوا کرتے ہیں اور لوگوں کو اِن تکلیف دہ عوارض سے پریشان کرنا اُن کی فطرت میں داخل ہے تب تو جیہہ مکمل ہو جاتی ہے۔قدیم زمانے میں جادوگرنیوں کو ایسے ہی مفروضات کا مجرم قرار دے کے ماردیا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے ذہن ایسی غیر سائنسی اور غیر فطری توجیہہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہڈسن کے نظریے نے بھی کسی قدر مقبولیت حاصل کی تھی اور اُس نے بڑی جرأت سے

اس بات کا اعلان کیا تھا کہ ہمارے دو نفس ہیں۔ایک ہم اور ایک ہمارا ہمزاد۔ایک باشعور ہمزاد جو ہماری زندگی کے ظاہری اعمال بجالاتا ہے اور دوسرا لاشعور ہے جو اُن تمام پراسرار اور غیر معمولی اعمال کا ذمہ دار ہے جن کی ہم توجیہہ نہیں کر سکتے۔اگر واقعی ہی ہمارے دو نفس ہیں اور اُن کے یہی فرائض ہیں تو علم النفس کو کسی قدر قابل قبول توجیہہ مل جاتی ہے۔جنوں اور بھوتوں کے مفروضوں سے کسی قدر بہتر ،لیکن دلائل و براہین سے اُسی قدر عاری ۔ ہڈسن کے نظریات سائنس کی حدود سے خارج تھے۔اگر چہ اس نے بھی ہمزاد کے ذریعہ امراض کے علاج کا ایک طریقہ رائج کیا تھا لیکن وہ اب ''لاشعور'' کی تاریخ کا ایک باب اغلاط بن کے رہ گیا ہے۔فرائیڈ کے لاشعور کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے ثبوت میں کوئی فطری بنیاد پیش کرے ورنہ یہ بھی اسی کتاب کا ایک باب بن جائے گا۔ڈملاپ کا کہنا ہے کہ فرائیڈ کے لاشعور کی حقیقت میں کوئی سائنسی بنیاد نہیں۔وہ اسے اتنا ہی مردود قرار دیتا ہے جتنا بھوت کے سائے یا ہڈسن کے ہمزاد کو۔دوسرے اہل علم جن میں نفسیاتی معالجوں کی اکثریت ہے کہتے ہیں کہ لاشعور کی تھوڑی بہت تو بنیاد موجود ہے لیکن اس کے شواہد اس قدر کمزور ہیں کہ فرائیڈ کے لاشعور کو کسی حال میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔چنانچہ پروفیسر جسٹر نے آخری نتیجہ یہ نکالا کہ میں یہ کہنے پہ خود کو مجبور پاتا ہوں کہ فرائیڈ کا لاشعور ایک بے بنیاد افسانہ ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ اس بات میں اب کوئی شک نہیں کہ فرائیڈ کا یہ خیال کہ جذبات لاشعور میں طوفانِ بدتمیزی اٹھائے رہتے ہیں ہر پہلو سے غلط قرار پاتا ہے۔اس لیے کہ ماہرین نے اس بات کے ثبوت پیش کر دیئے ہیں کہ جذبات وقتی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں انھیں دوام اور بقا نہیں ۔وہ وقتی طور پہ پیدا

ہوتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔ جذبات غدودوں میں کیمیائی عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جسم کے مختلف حصوں میں عارضی طور پہ نمودار ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر میں اپنا مظاہرہ کر کے ختم ہو جاتے ہیں۔ دماغ کے کسی حصہ شعور یا لاشعور میں اُن کا کوئی مسکن نہیں۔ تاہم حافظہ میں مرحوم جذبات کی یادیں اسی طرح برقرار رہتی ہیں جس طرح دیگر مشاہدات کی۔ لیکن وہ نہ کسی ہیجان کی صلاحیت رکھتی ہیں اور نہ اُن سے کسی قسم کا کوئی ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ فرائیڈ کے شعور یا لاشعور کا نظریاتی محل ریت کے کسی تودے کی طرح بیٹھ گیا۔

✡✡✡✡✡✡

آیئے اب ذرا "ننھے کی شہوت یا اوڈی پس کمپلیکس کا جائزہ لیتے ہیں۔

فرائیڈ کا یہ خیال کہ جنسی شہوت کا جذبہ ہی واحد اور بنیادی جذبہ ہے جو استقرارِ حمل کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور بچے کی پیدائش کے وقت سے ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور باقی تمام جذبات اسی بنیادی جذبے سے نمودار ہوتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

☜ جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ:

فرائیڈ کا یہ تخیل تمام تر بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ غدودوں کے علم نے اس نظریہ کو جہالت محض ثابت کر دیا ہے۔ آج بیالوجی کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جذبات مختلف غدودوں کے علیحدہ علیحدہ کیمیاوی مادوں سے پیدا ہوتے ہیں اور جنسی شہوت کو پیدا کرنے والی غدودیں دوسرے جذبات پیدا نہیں کر سکتیں۔ جنسی شہوت کا جذبہ سن بلوغت سے پہلے پیدا نہیں ہو سکتا۔ ماہرین نے بتایا ہے کہ جنسی شہوت کے علاوہ دیگر جذبات پیدا کرنے والی غدودیں تو بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی کام شروع کر دیتی ہیں مگر جنسی شہوت کی غدودیں بچے کی پیدائش کے وقت ناپختہ

ہوتی ہیں اور دس بارہ سال کی عمر میں جا کے پختہ ہوتی ہیں۔ اُن کی پختگی کے بعد بھی بچہ کئی سال تک جنسی معلومات نہ ہونے کی بنا پہ صحبت پہ قادر نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی بچہ اِن امور سے مماثل حرکات کا مظاہرہ کرتا بھی ہے تو وہ بڑوں کی صحبت میں سیکھی ہوئی ظاہری حرکات کی محض نکالی ہوتی ہیں۔ اِن ثابت شدہ اور مسلّمہ حقائق کے مدنظر یہ خیال کہ جنسی شہوت کا جذبہ ہی واحد بنیادی جذبہ ہے غلط قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر دیگر جذبات شہوت ہی سے نکلے ہوتے تو انسان کے لیے اُس وقت تک کسی دوسرے جذبے کا مظاہرہ کرنا ممکن نہ ہوتا جب تک کہ جذبہ شہوت کے کیمیائی مادوں کو پیدا کرنے والی غدودیں مکمل ہو کر اپنا عمل شروع نہ کر دیتیں۔ لیکن عام مشاہدہ اس کے برعکس ہے اس لیے کہ بچہ اپنی پیدائش کے تھوڑے ہی دِنوں بعد بچہ اپنی ماں کو پہچاننا شروع کر دیتا ہے، بلکہ جدید ترین تحقیق سے تو یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ پیدائش سے قبل ہی بچہ اپنی ماں کی آواز کو پہچاننے لگتا ہے اور پیدائش کے بعد وہ اپنے باپ اور چچاؤں اور پھوپھیوں یا جو اس سے زیادہ قریب ہوں، زیادہ محبت کریں بچہ اُس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ جب وہ روتا ہے تو چاہے دس لوگ اُسے چپ کراتے رہیں وہ چپ نہیں کرے گا مگر ماں کی گود میں جاتے ہی اپنے ماں کے بدن کی خوشبو سے وہ جان جاتا ہے کہ اب وہ اپنی ماں کے پاس ہے اس لیے فوراً ہی چپ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں جذبہ شہوت کو اگر کسی دوسرے جذبے کی اولاد قرار دیا جاتا تب بھی بات سمجھ میں آنے والی تھی کیونکہ یہ جذبہ دیگر جذبوں کے بعد نمودار ہوتا ہے۔ فرائیڈ کے نظریہ سے تو ایسا ہی لگتا ہے جیسے بچہ پہلے پیدا ہوا اور ماں بعد میں؟؟؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ہر صاحب اولاد جو اپنے بچوں کی حرکات وسکنات کا کسی قدر مطالعہ کرتا ہے جانتا ہے کہ پانچ چھ سال کے معصوم بچوں کا جذبہ شہوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔ بلکہ وہ تو اگر اپنے ماں باپ کو اس حالت میں دیکھ لیں تو یہ سمجھنے سے

قطعی قاصر رہتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ حیران رہ جاتے ہیں کہ اُن کے ماں باپ اس عجیب قسم کی ہاتھا پائی میں کیوں مشغول ہیں۔ اس سے زیادہ نہ اُن کا ذہن کام کر سکتا ہے اور نہ ہی اُن کی کوئی حس مشتعل ہوتی ہے۔ لیکن فرائیڈ اور اُس کے متبعین کی ہٹ دھرمی سے مجبور ہو کے ماہرین نفسیات کو اس بدیہی حقیقت کا تفصیلی مطالعہ کرنا پڑا۔ انھوں نے کم عمر لڑکے اور لڑکیوں کی کثیر تعداد کو طویل عرصہ تک زیر مطالعہ رکھ کر شواہد کے ساتھ یہ نتیجہ شائع کیا کہ ''ننھے کی شہوت'' بے بنیاد افسانہ ہے اور اوڈی پس کمپلیکس محض ایک خیالی دھوکا۔ کمسن بچوں میں شہوت جنسی کا نہ تو کوئی جذبہ ہوتا ہے اور نہ ہی انھیں اس کا کوئی شعور ہوتا ہے۔ لڑکی کے مقابلے لڑکے کا ماں کی طرف کوئی خاص رجحان نہیں ہوتا اور لڑکی کا باپ سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا۔ لڑکی اور ماں میں یا لڑکے اور باپ میں نفرت کا مطلق کوئی جذبہ ہوتا ہی نہیں اور اس جذبے کا وجود سرے سے بے بنیاد ہے جس کی فرائیڈ دہائی دیتا ہے۔ کمسن بچوں میں جہاں کہیں رقابت اور نفرت کا جذبہ دیکھا گیا ہے اس کا ہدف ہمیشہ دوسرے بچوں ہی کو پایا گیا ہے جو اُن کے کھلونوں پہ قبضہ کرنا چاہتے ہوں۔

✡✡✡✡✡✡

☜ اور فرائیڈ کا یہ کہنا کہ:

انسانی دماغ کا محتسب انسانی جذبات کو بار بار رد کر دیتا ہے اور انھیں واپس لاشعور میں دھکیل دیتا ہے جس سے نفسیاتی گھٹن پیدا ہوتی ہے جو انسان میں نفسیاتی عوارض کا باعث بنتی ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ:

عقلی بنیادوں اور جدید ترین سائنسی تحقیق نے فرائیڈ کے اس نظریے کو بھی باطل ثابت کر دیا ہے۔بات صرف اتنی سی ہے کہ عقل میں تمدن کے تقاضوں اور انسانی نفس کی خواہشات کے مابین تناؤ کی ایک صورت تو بہر حال موجود ہوتی ہے مگر اس کو کسی صورت بھی تصادم قرار نہیں دیا جا سکتا۔چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جذبات کے مظاہرے عقل کے تقاضے اور تصادم کا امکان تینوں ہی شعوری کیفیتیں ہیں۔اُن میں سے کسی کے لیے تحت الشعور یا لاشعوری سطح متعین کرنا خلافِ حقیقت ہے۔نفس انسانی ایک وحدت ہے، انسانی جذبات کیا چاہتے ہیں اُس سے پوشیدہ نہیں۔اُس کی عقل کا تقاضا کیا ہے اُس پہ مستور نہیں۔لہٰذا دونوں تقاضوں میں سے کسی شعوری یا لاشعوری تصادم کا کوئی امکان نہیں۔انسان پورے شعور کے ساتھ اپنے ماحول کا ادراک رکھتا ہے۔یہ فیصلہ اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنے جذبات کو لگام دے یا اُن کی پیروی کرے اور انھیں آزاد چھوڑ دے۔اگر وہ یہ فیصلہ کرے کہ جذبات کو کھلا چھوڑ دینا ہے تو عقل کے تقاضے داخل دفتر کر دیئے جائیں گے۔تصادم کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور انسان کھل کھیلتا ہے یہ الگ بات ہے کہ معاشرے سے اُس کی عزت و قار مٹ جاتا ہے۔اور اگر انسان فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے اپنے جذبات کو لگام ڈالنی ہے اور معاشرے کا اچھا شہری بننا ہے تب بھی اُس کے اندر جذبات کا کوئی تصادم نہیں ہوتا بلکہ تہذیب و تمدن نے انسان کو جن اخلاقی اقدار کا پابند کیا ہے وہ انسان کی زندگی میں توازن کا باعث بنتی ہیں۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ فرائیڈ نے اپنی جہالت سے جذبات کی حبس و قید کو نفسیاتی الجھنوں کا باعث قرار دیا ہے۔حالانکہ قدرت نے خلقی طور پہ انسانی جسم میں ایسے انتظامات مقرر فرما رکھے ہیں کہ جذبات کی حبس بے جا کی نوبت ہی نہیں آتی۔اور اگر ماحول کی مجبوری یا خود انسان کا اپنا آہنی ارادہ جذبات کو قدرے دبا کے رکھتے ہیں تب بھی قدرت کی طرف سے مہیا کردہ انتشاری فوارے (ESCAPE VALVES) فوراً ہی کھل جاتے ہیں اور جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور انسان کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ

راہبانیت کی طرف مائل اخلاق وروحانیت کے دلدادہ نوجوان جو اپنے جنسی شہوت کے جذبہ کو کچلنے کی کوشش میں مشغول ہوتے ہیں تو جب اُن کے جنسی جذبات ایک حد سے زیادہ دباؤ محسوس کرتے ہیں تو احتلام کے ذریعے قدرتی طور پہ وہ دباؤ ختم ہو جاتا ہے۔شدید غصے کی حالت میں لڑتا ہوا انسان جب قوی تر کے مقابل خود کو بے دست و پا پاتا ہے تو اُس کے غصہ کی شدت پہلے غم کی شکل اختیار کرتی ہے اور پھر اشکباری اُسے اِس غم سے نجات دلا دیتی ہے۔ باعزم انسان بھی جب شدتِ غم میں اپنے جذباتِ غم واندوہ کو دبانا چاہتا ہے تو اُس کی آنکھوں کے لبریز پیانے اُسے اُس اذیت سے نجات دلا دیتے ہیں جس میں وہ مبتلا ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ پرسکون ہو جاتا ہے۔اسی طرح خوف وہیبت کی شدت سے جب انسان بے بسی محسوس کرتا ہے تو اس کے نازک جذباتی آلات کو شکستگی سے بچانے کے لیے سکتہ یا بیہوشی اُس کی دستگیری کرتے ہیں۔مگر ہوش میں آنے پر انسان خود کو ہلکا پھلکا اور بغیر کسی دباؤ کے ہشاش بشاش پاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ اسی طرح فرائیڈ نے خوابوں کے بارے میں جو تخیل پیش کیا وہ بھی عبث ثابت ہوا۔

✡✡✡✡✡✡

☜ جواب دعویٰ یہ ہے کہ:

یہ خیال کہ اکثر خواب پراگندہ خیالی کا نتیجہ ہوتے ہیں نہایت قدیم خیال ہے جو ایک حد تک درست بھی معلوم ہوتا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پراگندہ خیالی ہی تمام خوابوں کا سبب ہے۔طوالت کا خوف تفصیلات سے مانع ہے مگر انسانی تاریخ شاہد ہے کہ کئی لوگوں نے

خواب میں نظم ونثر کے عمدہ نمونے مرتب کیے ہیں۔کئی ایجادوں کے مرکزی خیال کی رہنمائی خوابوں ہی میں کی گئی، کئی لوگوں نے خوابوں میں مستقبل کے حالات بھی بتائے ہیں۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ خواب میں صرف پراگندہ خیالی ہی کارفرما نہیں ہوا کرتی بلکہ فکرونظر کا ارتکاز بھی ہوا کرتا ہے، تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ بھی اور علوم غیب کے انکشافات بھی۔ مادہ پرست دانشور چونکہ غیر مادی اسباب کو احتمالی طور پہ بھی ماننے کو آمادہ نہیں ہوتے اس لیے وہ روحانیت کی طرف مائل قبیلے کے مشاہدات ومکاشفات کو درخوراعتناء نہیں سمجھتے۔ وہ اس بات پہ غور کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے کہ شاید اُن کی باتوں میں کوئی حقیقت مستور ہو۔لہٰذا اُن سے یہ کہنا کہ خوابوں کے کچھ اسباب انسانی نفس میں موجود ہیں تو کچھ اور اسباب ماورائی بھی ہیں بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ وہ اپنی آنکھوں پہ تعصب کی پٹی باندھ کر کسی ایسی حقیقت کو دیکھنا ہی نہیں چاہتے جو اُن کی خیالی دنیا سے باہر ہو۔خواب کی دنیا ایک وسیع دنیا ہے جس میں پراگندہ خیالی بھی ہے اور خیال آرائی بھی، عقل وخرد کے کرشمے بھی ہیں اور جذبات ومحبت کی نمائشیں بھی، جنت ارضی کے نظارے بھی ہیں اور عذابِ دوزخ کی سوزش بھی، نفس کی جذباتی الجھنیں بھی ہیں اور روح کی بلند پروازیاں بھی، عالم بالا سے تعلق کی استواری بھی اور دیدار رسول اللہ ﷺ بھی، یہ ایک وسیع دنیا ہے جس کو بلی کے خواب میں چھیچھڑے کہہ کے محدود کرنا جہالت محض ہے۔

چنانچہ فرائیڈ ہو یا ڈارون زندگی کے جاہلی نظریات کے داعی تھے۔انھوں نے انسانیت کو خیر کا کوئی پیغام نہیں دیا۔خالق سے بے اعتنائی نے اہل مغرب کے دل سخت کر دیئے جس کی وجہ سے اُن کی خارجہ پالیسی نے خطہ ارض کا چہرہ لہولوہان کر رکھا ہے۔ وہ صرف مفادات کی زبان سمجھتے ہیں اور اپنے فائدے کے لیے نوع انسانی کے خون سے ہولی کھیلنے سے بھی نہیں چوکتے۔ جنسی حیوانیت نے اُن کے روحانی احساس کو کچل کے رکھ دیا ہے۔ غیر فطری زندگی نے اُن کے اندر اس قدر بگاڑ پیدا کر دیا ہے کہ وہ فرائیڈ کی جنسی آزادی کے اُس تخیل سے بھی آگے بڑھ

چکے ہیں جو اُس نے پیش کیا تھا۔ بلکہ آج تو وہ ہم جنس پرستی کے حق میں قوانین پاس کرانے میں منہمک ہیں۔لڑکا لڑکے کے ساتھ شادی کر رہا ہے اور لڑکی لڑکی سے لطف حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ وہ آگ جو فرائیڈ نے بھڑکائی تھی جنگل کی حدوں سے نکل کے آبادیوں کو مسمار کرنے کے درپئے ہے۔مگر مغرب کسی بھی عقلی دلیل کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اپنی عورت کو بے لباس کر کے وہ خود مہذب اور جدید رجحانات کا حامل قرار دیتا ہے اور دوسروں کو جاہل اور دقیانوسی کہتا ہے۔کبھی وہ ایک الہامی دین کے پیرو تھے مگر آج وہ دین کے لفظ تک سے آشنا نہیں ۔اللہ اُن پہ رحم فرمائے اور ہمیں ہدایت پہ کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین (20*)

✡ ✡ ✡

مارکس ازم

خطہ ارض پہ اگر چہ ہمیشہ سے لوگوں کا ایک ایسا گروہ ضرور موجود رہا ہے جن کی عقلوں نے اُن کو دھوکا دیا اور انھوں نے خالق کے وجود کا انکار کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کی تعداد ہمیشہ قلیل ہی رہی۔ مگر لادینیت اور الحاد کی جو لہر مارکس کے نظریات کے بعد اٹھی اُس نے لوگوں کے انبوہ کثیر کو گمراہی کے اندھیروں کی نظر کر دیا۔ آج خطہ ارض پہ دو ارب سے زائد لوگ خدا کا انکار کرنے والے ہیں۔ آج ملحدین کا یہ قبیلہ کارل مارکس کا پیرو ہے۔ کارل مارکس نے لوگوں کو اس بات کی طرف بلایا کہ انسان کے سارے دکھوں کا مداوا مادی برتری میں پنہاں ہے۔ مذہب صرف انسان کی توہم پرستی ہے اور انسان کو خدا کے تصور سے آزاد زندگی بسر کرنی چاہیے کیونکہ مذہب کی قید میں انسان مادی ترقی نہیں کر سکتا۔ کارل مارکس (1818-1883ء) ایک جرمن نژاد یہودی تھا۔ جس نے اپنے نظریات میں منفی رجحانات کو فروغ دیا۔ یہ وہ دور تھا جب مغرب میں مادیت کی لہر عروج پہ تھی۔ مغربی لوگ ابھی کلیسا کے جبر کو بھولے نہ تھے۔ وہ پہلے ہی دین سے بیزار تھے اور جب انھیں نظریاتی اور علمی سہارا

بھی مل گیا تو وہ خالق سے مزید بے اعتناء ہو گئے۔ یاد رہے کہ مغربی معاشرے قولاً ملحد نہیں بلکہ عملاً ملحد ہیں۔ زبان سے وہ خالق کا انکار نہیں کرتے بلکہ اپنے عمل سے خالق کی نفی کرتے ہیں۔ کارل مارکس کی تحریک کے بعد دنیا کے بہت سے ممالک نے الحاد کو اپنا لیا اور خالق سے انکاری ہو گئے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مغرب میں جب سائنسی علوم کے عروج نے مادہ پرستی کے رجحان کو فروغ دیا تو فارغ البال لوگوں نے لادینی مادہ پرستی (DIALECTICAL MATERIALISM) کو اپنا شعار بنانا شروع کر دیا۔ نئی نئی ایجادات اور سرمایہ داری کی برکتوں نے معیار زندگی بلند کر رکھا تھا اور فارغ البالی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جمہوری خیالات کی اشاعت ہونے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ شاہی طرز کی حکومتیں یکے بعد دیگرے جمہوریت یا نیم جمہوریتوں میں تبدیل ہونے لگیں تھیں۔ جمہوری خیالات کی اشاعت میں سرمایہ دار طبقہ پیش پیش تھا لیکن جمہوریت ہی کی روشنی میں سرمایہ داری کی خرابیوں پر نظریں پڑنے لگیں۔ صنعتی دور کے مزدوروں کی خستہ حالی نے کئی فارغ البال دانشوروں کو متوجہ کرنا شروع کیا اور انھوں نے معاشی اور معاشرتی عدل کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اول اول اِن لوگوں کو سول سوشلسٹ کہا گیا۔ سرمایہ داری کی خرابیوں پر متوجہ ہونے والے اِن افراد میں ایک کارل مارکس بھی تھا۔

کارل مارکس کے نظریات پہ روشنی ڈالتے ہوئے اُس کا روحانی شاگرد (FREDRIC ENGELS) لکھتا ہے کہ:

”جس طرح ڈارون نے نامیاتی کائنات کا قانون ارتقاء دریافت کیا تھا اسی طرح مارکس نے یہ قانون دریافت کیا کہ انسانی تاریخ کس طرح ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ خیالی نظریات کے گھنے جنگلوں میں یہ سادہ حقیقت اب تک مستور پڑی تھی کہ انسان سیاست سائنس آرٹ اور مذہب وغیرہ میں مصروف ہونے سے پہلے کھانے پینے اور لباس کا محتاج تھا۔ لہٰذا بقائے حیات کے مادی اسباب کی پیداوار ہی بقاء انسان

کی بنیادی اساس ہے۔ چنانچہ ہر دور میں کسی معاشرہ کی معاشی ترقی کا معیار ہی وہ بنیادیں فراہم کرتا ہے جن پہ متعلقہ لوگوں کی سیاسی تنظیمیں، قانونی نظریات، آرٹ بلکہ مذہبی افکار تک استوار ہوا کرتے ہیں۔اس لیے مؤخر الذکر امور کی توجیہہ اِنھی معاشی اسباب کی روشنی میں کی جانی چاہیے نہ کہ اس کے برعکس جیسا کہ اب تک کیا جاتا رہا ہے"۔

✡✡✡✡✡✡

کارل مارکس نے سرمایہ داری نظام کے جبر کے خلاف اور سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی کشمکش کے مطالعہ کے بعد سرمایہ (DAS KAPITAL) نامی ضخیم کتاب لکھی جو تین جلدوں پہ مشتمل تھی۔ اس کتاب میں یہ مرکزی خیال پیش کیا گیا کہ ترقی پذیر تمدن کے مشینی دور نے پیداوار کے ارزاں میکانی طریقوں نے ایک طرف تو سرمایہ کے ارتکاز کو تقویت بخشی تو دوسری طرف گھریلو صنعتوں کی تباہی سے مزدوروں کی کثیر تعداد بے روزگار ہوگئی اور وہ اس بات پہ مجبور ہوگئے کہ کارخانہ دار کی شرائط پہ کام کریں۔تب مزدوروں کی اکثریت کی حق تلفی ہونے لگی۔ وہ روزانہ کی اجرت پہ کام کرنے لگے اور آجیر آجر کے حق خدمت کا بڑا حصہ خود رکھ لیتا۔
مزدوروں کا خون چوس چوس کر سرمایہ دار کی گردن موٹی ہونے لگی اور مزدور زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو بھی ترسنے لگا۔ اگر مارکس کے نظریات یہیں تک رہتے تو دنیا کو اس پہ زیادہ اعتراض نہ تھا اور کسی حد تک مارکس کا موقف درست بھی تھا۔مگر مارکس نے دوسرا حملہ مذہب پہ کیا جسے دنیا کی اکثریت نے قبول نہ کیا۔اس لیے اگرچہ اُس کے متبعین کی تعداد کثیر ہے مگر تاریخ کے کسی بھی دور میں وہ مذہب پسندوں سے نہ بڑھ سکی۔ مارکس نے کہا کہ مذہبی اجارہ دار سرمایہ دار ہی کے کارندے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ سرمایہ دار کو تلقین کریں کہ وہ مزدور کا حق ادا کرے وہ مزدور کو تلقین کرتے ہیں کہ خالق کی مرضی یہی تھی کہ مزدور تنگ دست رہے۔ چنانچہ مارکس نے مزدور کو تیار کیا کہ وہ متحد ہو جائے

اور نظام سرمایہ داری کا تختہ الٹ دیں اور ایک ایسے نظام کی بناڈالیں جس میں سرمایہ داری کے دوبارہ جنم لینے کا امکان ختم ہو جائے۔ مارکس نے بتایا کہ اُس کے وضع کردہ نظام سے ارتقائے معیشت کا یہی فطری قانون بام عروج پہ پہنچ جائے گا جس سے نظام سرمایہ داری اپنی موت خود مر جائے گا۔ مارکس کے اس فطری قانون معیشت کو اُس کی اپنی قوم جرمنی نے رد کر دیا۔ انگلستان نے اسے ذرا بھی درخور اعتناء نہ سمجھا اور تب یہی دونوں قومیں معیشت کے بام عروج پہ تھیں۔ اس لیے کارل مارکس اپنے اس خواب کو سینے سے لگائے ہوئے ذلت کی موت مر گیا کہ دنیا خدا کا انکار کر دے گی اور اُس کے نظریہ حیات کو اپنا لے گی۔ تاہم اُس کے روحانی شاگرد اینجلز نے مارکس کے انقلابی خیال کی مسلسل اشاعت کی اور مزدوروں کو سرمایہ درانہ نظام کے خلاف متحد کیا۔ کیمونسٹ لیگ کی بنیاد رکھی اور کیمونزم کا بنیادی دستور وضع کیا جس میں اُس نے مذہب کے خلاف نظام سرمایہ داری سے بھی زیادہ زہر اُگلا۔ کیمونزم کے بنیادی دستور کی چند دفعات ذیل میں تحریر کی جاتی ہیں۔

اینجلز نے لکھا کہ:

"کیمونسٹ پارٹی اس بات کو نہیں چھپاتی کہ وہ مذہب کو بالکل رد کرتی ہے اور کائنات سے متعلق اسے غیر سائنسی اور دقیانوسی نظریہ قرار دیتی ہے۔ دہریت کی لادینی تعلیم کی اشاعت اور مذہب کے خلاف منظم نظریاتی جہاد کے بغیر حقیقی اشتراکی نظریہ حیات کا تصور ہی ممکن نہیں۔ روسی کیمونسٹ پارٹی کا پروگرام مذہبی عقائد کی نامعقولیت کی وضاحت اور دہریت کی مسلسل تبلیغ قرار دیتا ہے۔ مذہب لوگوں کی روزمرہ زندگی میں غالب آنے والی مادی طاقتوں کا اُن کے دلوں میں ایک بے ہنگم پرتو ہے۔ ایک ایسا عکس جس میں کائناتی توانائیاں ہی مافوق طاقتوں سے متصف کر دی جاتی ہیں۔ داستانوں، لوک کہانیوں اور آرٹ کی دوسری شکلوں میں یہ تو ضروری نہیں کہ خیالات کی پرواز کو حقیقی سمجھا جائے لیکن اس کے برعکس مذہب خدا، شیطان اور

فرشتوں کے خیالی تصورات ہی کو حقیقی سمجھتا ہے۔تمام مذاہب میں یہ قدر مشترک ہے کہ مافوق طاقتوں پر یہ اعتقاد رکھا جائے۔لوگوں نے مافوق طاقتوں پر یہ اعتقاد کہاں سے اپنایا اور ایسی ہستی کو جس کا کوئی وجود ہی نہیں انسان نے کیونکر تسلیم کر لیا۔مافوق طاقتوں پر اعتقاد، مذہب وتمدن سے ماقبل زمانے کے وحشی انسان کی بے بسی ظاہر کرتا ہے۔ماقبل تاریخ وحشی دور میں لوگ تمام تر کائناتی طاقتوں کے بے بس غلام تھے۔ بادلوں کی گھن گرج، بجلی کی چمک، بارش سمندروں کی مدوجزر، سیلابوں، زلزلوں، آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے، بیماریوں، اموات اور خوابوں کے قدرتی مظاہروں کی توجیہہ کرنے سے یکسر قاصر تھے۔اِن مشاہدات اور اسی قسم کے دوسرے مشاہدات کی توجیہہ کے تقاضے تو بڑھتے چلے گئے۔لیکن حصول علم کے اسباب بالکل ہی کمیاب تھے۔لوگوں نے انسانوں اور قدرتی توانائیوں کو ہی مافوق طاقتوں سے متصف کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ پوجا پاٹھ، عبادت دُعا اور قربانی کے طریقے رائج کر لیے۔اس طرح ابتدائی دور میں پیدا ہونے والے مذہبی اعتقادات سرمایہ دار معاشرہ میں اب بھی موجود چلے آ رہے ہیں۔مزدور عوام کی سماجی بدحالی، سرمایہ کی اندھی طاقت کا خوف، اندھی اس لیے کہ عوام اس کی پیش قیاسی نہیں کر سکتے۔ایسی اندھی طاقتیں جو مزدوروں اور چھوٹے کاروباریوں کو زندگی کے ہر گام پر اچانک غیر متوقع اور حادثاتی تباہی بربادی، قلاشی، استحصال، فاقہ کشی اور موت سے ڈراتی بھی ہیں اور اُن میں مبتلا بھی کرتی ہیں۔یہی مروجہ مذاہب کی جڑ ہیں۔مادہ پرستوں کو یہ حقیقت بطور خاص اور مسلسل پیش نظر رکھنی چاہیے۔عوام اُن مصائب وآلام سے نجات کے لیے جو استحصالی معاشرہ اُن پر عائد کرتا ہے اس کی وجہ سے لوگ مذاہب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔بے روزگاری کے خوف، افلاس اور ایٹمی جنگ کے خدشات نے مستقبل کو غیر یقینی اور مخدوش بنا رکھا ہے اور سرمایہ دارانہ معاشرہ کے سماجی تضاد سے کوئی راہ

نجات نہ پا کر اکثر لوگ مذہب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تا کہ انھیں خوف و ہراس سے نجات ملے۔ مذہب کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ سائنس کا غیر ہو۔ یہ علم ایسا نہیں جو انسان کی قوت اور کائنات پر اس کی قدرت کو واضح کرے۔ بلکہ ایک اندھی عقیدت ہے جو بنیادی طور پر خوف و ہراس پر مبنی ہے۔ عقیدت کو کوئی ثابت نہیں کیا کرتا اُسے آزمایا ہی جاتا ہے مذہب انسان کی عقل، تجربہ اور مشاہدہ سے نہیں بلکہ اس کے جذبات سے خطاب کرتا ہے۔ یہ مصنوعی طور پہ جذبات کو مشتعل کرتا ہے۔ موت کے بعد خوشحالی کے وعدے کرتا ہے، سزا، جزا، لعنت ملامت ، سماجی مقاطعہ، جہنم کے خوف اور آگ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ مذہب لوگوں کے ذہنوں میں اندھا خوف پیدا کر کے انھیں ابدی زندگی کے سبز باغ دکھلاتا ہے۔ مذہب انسان سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے مقدر پہ قانع ہو جائے۔ زندگی کے آگے ہتھیار ڈال دے۔ مذہب کے جذباتی پہلو ہی مذہب کا تانا بانا ہیں۔ ہر مذہب نے مذہبی رسوم کے طریقے بنا رکھے ہیں۔ جن پر عقیدت منداس لیے عمل پیرا ہوا کرتے ہیں تا کہ مافوق طاقتوں کو متاثر کر سکیں۔ مذہبی رسومات کے یہ طریقے اہم نتائج کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ یہ عادت بن کر لوگوں کو مذہب کا غلام بنا لیتے ہیں۔ یہ وقتاً فوقتاً مذہبی تخیلات کو جنم دیتے ہیں اُن کو مستحکم کرتے ہیں اور تاریک تر اور مبہم جذبات کے دھاروں کو تیز کر دیتے ہیں جو مذہبی عقیدت سے وابستہ ہوتے ہیں۔

سوشلسٹ سوسائٹی میں مذہب کی سماجی جڑیں بالکل کٹ جاتی ہیں۔ سرمایہ داری کی موت کے ساتھ ہی انسان سے انسان کی لوٹ کھسوٹ اور سماجی استحصال ختم ہو جاتے ہیں البتہ معاشرہ کے کچھ لوگوں کے ذہنوں میں مذہبی عقیدت باقی رہ جاتی ہے۔ سوشلسٹ ممالک میں مذہب صرف اسی شکل میں ماضی کی یادگار کے طور پہ باقی رہ گیا ہے جب تک معتقدین زندہ ہیں، عبادت گاہیں اور پادری بھی باقی ہیں۔ سوشلسٹ

ممالک کے قوانین ضمیر کی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی عبادت کی آزادی بھی باقی ہے اور مذہب کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور لادینیت کی تعلیم دینے کی پوری پوری آزادی بھی۔مذہب کی باقی ماندہ یادگاریں اگرچہ سخت جان ہیں لیکن لازوال تو نہیں وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں گی۔ مارکس نے کہا کہ مذہب اس موہوم خوشحالی کی آرزو کا نام ہے جو خوش آئند مغالطوں کے محتاج معاشرے کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہیں لیکن جونہی لوگ اس سے آگاہ ہو جائیں گے کہ حقیقی خوشحالی کیا چیز ہے اور وہ کیسے حاصل ہوتی ہے تو مذہب کا وجود ختم ہو جائے گا"۔

✡✡✡✡✡✡

ماسکو سے شائع ہونے والی نظریہ کیمونزم کا پرچار کرتی ہوئی ایک اور کتاب (A Short Story of Pre-Capitalist Society) میں مذہب کے خلاف کچھ یوں زہر اُگلا گیا ہے۔

"محنت کش عوام پر جاگیردار طبقہ کا اقتدار برقرار رکھنے کے حربے صرف معاشی استحصال اور سیاسی استبداد ہی نہ تھے بلکہ نظریات حیات کو بھی موثر طور پہ استعمال کیا جاتا تھا۔جاگیری نظام میں مذہب اور کلیسا نے فیصلہ کن کردار انجام دیا۔کلیسا نے بتایا کہ اس دنیا کی مصیبتوں اور تکلیفوں کے بدلے دوسری دنیا میں جنت ملے گی۔کلیسا کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ محنت کش طبقہ میں اطاعت گزاری کا جذبہ پیدا کر کے انھیں جاگیرداری استبداد کے خلاف جدوجہد کرنے سے باز رکھا جا سکے۔مذہب اس دور میں روحانی زندگی پر ہمہ گیر اثر رکھتا تھا۔اور کلیسا کا کام یہ تھا کہ اپنے مذہبی اقتدار سے

مروجہ سماجی نظام کے نفاذ کی بنیادیں قائم رکھے۔ تاریخ کے جاگیرداری دور میں وسیع طور پر پھیلا ہوا دوسرا مذہب اسلام تھا۔ مسلمانوں کی مذہبی تنظیم نے ملک عرب میں جاگیرداری نظام کے نفاذ کی بنیادیں رکھیں اور اسلام ہی روحانی طور پہ اُن تمام ممالک کے جاگیرداری سماج پر حکمران رہا جو عربوں نے فتح کیے۔ پھر اسلام ایشیا، افریقہ اور کسی حد تک یورپ میں بھی پھیل گیا۔ اسلام نے استبداد اور استحصال کے مروجہ نظام کے جواز کا فتویٰ نافذ کیا۔ مسلمانوں کی کتاب قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم اللہ کی طرف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نافذ کر دی گئی ہے۔ عیسایت کی طرح اسلام نے بھی غریبوں کو حکمران طبقہ کے استبداد کے تحت روزمرہ کی مشقت آمیز زندگی کے صلہ میں مرنے کے بعد بہترین زندگی کا وعدہ کیا ہے۔ اپنے وسیع تر اثرات کی بدولت بدھ مت بھی دنیا کے اہم مذاہب میں شامل ہے۔ چنانچہ بدھ مت میں بھی جاگیردار طبقہ نے سماجی ناہمواریوں کو جائز ٹھہرایا''۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

لادینی مادی پرستی دلیل بیان کرتے ہوئے ملحدین نے کہا کہ:

انسانی فہم و ادراک چونکہ مشاہدات و تجربات کے تجزیہ اور تعمیر نو پر قادر ہیں اس لیے وہ تاثرات کی شکست و ریخت کی خیالی تصویریں بنا لیا کرتے تھے لیکن ضروری نہیں کہ وہ سب تصویریں حقیقی بھی ہوں۔ تخیل اور نظریات کی تمام شکلیں قابل اعتماد نہیں اور انھیں مادی حقائق کے برابر درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ تخیلات کی پرواز میں حقیقت اور واہمہ کے درمیان امتیاز کا معیار الگ حیثیت کا حامل ہے۔ اس نظریہ کے مطابق یہی امر مسلّمہ تسلیم کیا جائے گا جو اس کائناتی مادہ اور توانائی کی روشنی میں اپنی حقیقت کا ثبوت فراہم کر سکے اسے ہی حقیقی تسلیم کیا جائے گا اور خیالات کی بقیہ تمام پروازوں کو فرضی اور غیر حقیقی قرار دیا جائے گا۔ اس مادی نظریہ کے مطابق جن، شیاطین، فرشتے، دیوی دیوتا اور خدا

سب وہم کی ایجادیں ہیں جن کی کوئی سند نہیں اور مذہب کا سرچشمہ تمام تر توہم پرستی پہ مبنی ہے۔ حقیقت اور واہمہ کے درمیان امتیاز کا یہ طریقہ کار معقول اور عین منطقی ہے۔ چونکہ ہماری کائنات تمام تر مادی ہے اور انھی مادی تعبیروں میں ہمیں حقائق کا ثبوت تلاش کرنا ہے۔ اس لیے عقل و دانش کے نزدیک واحد معقول مسلک جدلیاتی یا لادینی مادہ پرستی ہی ہوسکتا ہے۔ اس نظریہ حیات کے مطابق تمام مذاہب دور جاہلیت کے حیوانی جذباتِ خوف و رجاء کی پیداوار ہیں۔ جنھیں معاشرہ نے اپنی نادانی سے غیر ضروری اہمیت دے کر اپنے ہی پاؤں کی زنجیر بنالیا۔ خودغرض لوگوں نے عوام کو ورغلانے اور اُن کو ناجائز استحصال کرنے کے لیے مذہب کو آلہ بنا رکھا ہے۔ خدا پرستی اور مذہبی تخیل، اپنی توہماتی نوعیت کی وجہ سے معاشرہ کی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ بنے ہوئے ہیں جنھیں ختم کرانا اشتراکی مادہ پرست معاشرے کا اولین فرض ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ سارا فسانہ جس پہ اشتراکیت کی ساری عمارت کھڑی ہے۔ چونکہ اُن لوگوں نے اپنے تخیل کو علمی اور عقلی بتایا ہے اس لیے ہم بھی اُن کے علم و عقل کی نارسائی کا تذکرہ کریں گے اور اِس بات کو اُن پہ کھول کے رکھ دیں گے کہ جسے وہ عقل سمجھتے رہے وہ بے عقلی تھی، جسے وہ علم سمجھ رہے تھے وہ جہالت تھی، جسے وہ روشنی سمجھ رہے تھے وہ اندھیرا تھا، جسے وہ نجات سمجھتے تھے وہ قید تھی، جسے وہ خوشی سمجھ رہے تھے وہ غم تھا، جسے وہ آزادی سمجھتے تھے وہ دھوکا تھا، جسے وہ آسانی سمجھ رہے تھے وہ مشکل تھی جسے وہ درست سمجھ رہے تھے وہ غلط تھا اور اب تو تاریخی طور پہ بھی یہ امر ظاہر ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ وہ خواب جو مارکس نے دنیا کے مزدوروں کو دکھایا تھا کب سے اپنی موت آپ مر چکا ہے۔ (21*)۔

✡✡✡✡✡✡

یہ چند نظریہ ہائے حیات جن کی بنا خالق کی بے اعتنائی پہ رکھی ہے انھوں نے ہی انسان کو الجھنوں اور پریشانیوں کے اُس اندھے غار میں دھکیلا ہے جہاں نظریات کے نہ ختم ہونے والے مباحث ہیں جہاں نظریات کا ٹکراؤ دنیا کا امن و سکون لوٹ لیتا ہے اور دنیا تیسری عالم گیر جنگ کی منتظر ہو جاتی

ہے۔ سرمایہ داری اور کیمونزم میں سرد جنگ نے قریب پچاس سال تک لوگوں کے جذبات و احساسات کو یرغمال بنائے رکھا۔ ایٹمی ہتھیاروں کی اس ہولناک جنگ کی ہیبت نے بہت سے سال لوگوں کی نیندوں کو حرام کیے رکھا۔ تاہم روس کے نظام معیشت میں ظاہر ہونے والے بڑے زوال نے اس جنگ کو روک دیا۔ لوگوں نے کہا کہ کیمونزم ناکام ہوگیا مگر اس کا یہ غلط مطلب نکال لیا گیا کہ سرمایہ داری نظام کامیاب ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں نظام ہائے زیست بنیادی اخلاقی اقدار سے عاری ہیں اس لیے دونوں ہی غیر منصفانہ اور غیر انسانی ہیں۔ دراصل تو یہ خالق ہی کا حق ہے کہ جس نے انسان کو پیدا کیا ہے وہی انسان کو بتائے کہ اُس نے دنیا میں کس طرح رہنا ہے۔ مگر انسان کی عقل نے اسے دھوکا دیا اور وہ سمجھا کہ عقل سے ہی وہ منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ نظام سرمایہ داری اور مارکسی نظریہ معیشت انسانی عقل کے شاخسانے ہیں بلکہ عقل کے دھوکے ہیں جنھوں نے انسانیت کو دکھ کے سوا کچھ بھی تو نہیں دیا۔ معاشیات کا تعلق چونکہ انسانی ارتقاء کی تاریخ کے ساتھ ہے اس لیے ہم بھی اس کو اسی تناظر میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

اقتصادی میدان میں انسان نے تمدن کے ابتدائی دور میں تبادلہ اجناس کے سادہ عمل سے آغاز سے کیا۔ جو آج بینکنگ، انشورنس اور فارن ایکسچینج کے پیچیدہ امور تک ترقی کر چکا ہے۔ اس اقتصادی ترقی کے دوران وہ کئی حقیقی مسائل سے بھی دوچار ہوا اور کئی مصنوعی مسائل خود بھی پیدا کرتا رہا۔ اِن تمام مسائل نے نظریاتی اختلافات اور چند عملی مغالطے پیدا کر دیئے ہیں جو ہماری اقتصادی زندگی میں خلفشار کا باعث بن رہے ہیں۔ اسلامی نظام معیشت، سرمایہ داری اور سوشلزم میں بنیادی اختلافات کا باعث یہی مسائل ہیں۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو انسان کو پیدا کرنے والے خالق نے انسانی زندگی کے قیام و بقاء کی خاطر اس کائنات میں نہایت بسیط اہتمام کیا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے قدرت نے جن اشیاء کا محتاج کیا

ہے وہ سب قدرت نے پیدا کی ہیں اُن میں سے کچھ تو وافر ہیں جن کے حصول کے لیے انسان کو کسی قسم کی کوئی تگ ودو نہیں کرنی پڑتی جیسے کہ ہوا اور پانی وغیرہ اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے حصول کے لیے انسان کو کسی قدر تگ ودو کرنی پڑتی ہے جیسے کہ غذا، لباس، مکان اور سواری وغیرہ۔ انسان کو اپنے ابتدائی دور میں جب اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا کہ ایک شخص کے پاس تو وافر مقدار میں ہرن کا گوشت ہے تو دوسرے شخص کے پاس بڑی مقدار میں پھل ہیں تو وہ دونوں آپس میں تبادلے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اب ہرن کا گوشت قیمتی ہے یا پھل؟ اس کا تعین دونوں اشخاص نے باہمی طور پہ کر لیا۔ یہی تجارت کی اولین شکل تھی۔ پھر ایک نئی صورت انسان کے سامنے آئی کہ وہ شخص جس کے پاس کل پھل تھے اُس کے پھل ختم ہو گئے مگر جس کے پاس ہرن کا گوشت تھا اُس کا گوشت ابھی موجود تھا۔ تب پھلوں والے شخص نے ہرن کے گوشت کی ملکیت والے شخص سے کہا۔ تم مجھے گوشت دے دو جب میرے درختوں پہ پھل آئیں گے تو میں پھل تمھیں دے دوں گا۔ لین دین کی یہ صورت تجارتی قرض کہلائی۔ اِن ہی دونوں تجربوں کی بنا پہ عقل سلیم کے مطالبے کے عین مطابق اسلام نے تجارتی اور دیگر قرضوں کے متعلق احکامات نافذ کیے ہیں۔

اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور یہ اسلامی معیشت کا پہلا اصول ہے۔ سود کی حرمت کا اظہار اور اس کے عدم جواز کا فتویٰ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ سود انسانیت کے لیے مضر ہے۔ اس لیے کہ قرض صرف مصیبت میں مبتلا شخص کی عارضی اعانت ہے۔ لہٰذا اس پر کسی منفعت اور سود کی توقع انسانی ہمدردی سے مغائر ہے۔ کسی مصیبت زدہ کی اعانت کرنا ایک ایثار ہے جو ذاتی خود غرضی کے جذبہ کی قربانی کا دوسرا نام ہے۔ اس ایثار کی کوئی قیمت وصول کرنا انسانیت کی توہین ہے۔ لہٰذا قرض پہ سود کا کوئی جواز نہیں۔ اسلام میں قرض کا تصور صرف اضطراری احتیاج تک محدود ہی ہے۔ تجارتی کاروبار کے لیے اس کا کوئی جواز نہیں۔ اِن معاملات میں قرآنی احکامات اور سنت رسول سے واضح رہنمائی ملتی ہے۔ مگر یہ اِن تفصیلات کی جگہ نہیں اس معاملے

کی تحقیق پہ بہت سی کتابیں خاص اسی موضوع پہ تحریر کی جا چکی ہیں جن سے اسلامی معاشیات کا اصل تصور اجاگر ہوتا ہے۔اس ضمن میں جناب سیّد محمد اسماعیل کی کتاب(CRITICAL ANALYSIS OF CAPATILISM,SOCIALISM AND ISLAMIC ORDER.)یقیناً اس موضوع پہ ایک عمدہ اور تحقیقی کتاب ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اسلام نہ تو سلطانی کا علمبردار ہے اور نہ ہی مغربی جمہوریت کا۔اسلام نہ جاگیرداری کا وکیل ہے نہ سرمایہ داری کا اور نہ ہی سوشلزم کا۔اسلام نے ایک نظریہ حیات پیش کیا ہے سیاست ومعیشت کی چند بنیادی قدریں نافذ کی ہیں چند حدود و قیود وضع کیے ہیں اور حکم دیا ہے کہ اِن بنیادی قدروں کی حدود و قیود کی روشنی میں زمان و مکان کی ضرورتوں کے مطابق سماجی، سیاسی اور معاشی نظام ایجاد کرتے چلے جائیں۔لوگوں نے سود کے ضمن میں بہت سے سوال اٹھائے ہیں۔انسان نے سود کو ایک ضدی بچے کی طرح اپنایا ہوا ہے۔لوگوں کا خیال ہے کہ سود کے بغیر انسان ترقی نہیں کرسکتا ہے دراصل یہ خالق کے ساتھ ایک ایسی ضد ہے جسے مسلمان معاشروں سمیت بہت سی اقوام نے اپنا رکھا ہے۔حالانکہ ذرا سی گہرائی میں جا کر دیکھنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ انسان پہ انسان نے آج تک جو سب سے بڑا ظلم کیا ہے وہ سود ہے۔سود ہی سے معاشی نظام کی اُن مصیبتوں نے جنم لیا ہے جن میں انسانیت سسک رہی ہے۔جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس موضوع کی تفصیلات مہیب ہیں جنھیں طوالت کے خوف سے نظرانداز کیا جا رہا ہے۔

اشتراکیت بھی اپنی طرز کا ایک ظلم تھا جسے کارل مارکس نے دنیا میں رواج دیا۔اس لیے کہ اگرچہ ظاہری طور پہ اس میں انسانی ہمدردی کے تصور کو اجاگر کیا گیا تھا۔مگر حقیقت یہ تھی کہ مارکس کی خیالی جنت کے پیچھے خالص عقلی بنیادوں سے دلیل حاصل نہ کی گئی تھی بلکہ یہ ایک دیوانے کی بڑھتی جسے دنیا نے رد کر دیا۔یہ ایک ایسا تصور تھا جس میں نہ سرمایہ دار کی ذہنیت کو مد نظر رکھا گیا تھا اور نہ مزدور کی مجبوریوں اور پست ذہنی حالت کو سامنے رکھا گیا۔اس لیے کہ

مارکس نہ تو مزدور تھا اور نہ سرمایہ دار۔ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار ایک ایسا شخص تھا جس نے خدا کا انکار کیا۔ اس انکار کے پیچھے بھی اُس نے عقلی بنیادوں کی بجائے اپنے ذاتی تخیل کو سامنے رکھا۔ کچھ مغربی اقوام نے مارکس کے نظریات کی تائید کی۔ انھوں نے مارکس کے معاشی تخیل کو تو رد کر دیا مگر مذہب کے بارے میں اُس کے لا ابالی نظریات کو عقلی نظریات قرار دے ڈالا۔ وہ ایک الہامی مذہب کے پیرو تھے اس کے باوجود انھوں نے خاموشی اختیار کی بلکہ کسی حد تک اُس کی تائید بھی کی۔ اس لیے یہاں مارکس کے مادی کائنات کے نظریے کے رد میں عقلی دلائل سے استنباط کیا جاتا ہے۔ مارکس نے کہا کہ اس کائنات کی تمام نیرنگیاں صرف کائناتی مادہ اور کائناتی توانائی کی مختلف اشکال کے عمل کا ردِعمل ہیں۔ اور کوئی مادی شئے یا علت موجود نہیں اور انھی کے مسلمات کے مطابق ہر شئے کے وجود کے نفاذ کا کوئی نہ کوئی سبب ہونا ضروری ہے۔ بے سبب اور بلا علت نہ تو کوئی چیز وجود میں آسکتی ہے اور نہ ہی کوئی تبدیلی واقعہ ہوسکتی ہے۔

اِن دو مسلمات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بات پہ غور کیا جائے کہ کیا مادہ اور توانائی کی تمام موجودہ اشکال ازل سے ہیں یا ایک دوسرے سے پیدا ہوئی ہیں؟ کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پیچیدہ تر اشکال سادہ تر اشکال سے پیدا ہوئی ہیں اور مادہ کی تمام شکلیں مادی عناصر سے مرکب ہیں اور مادی عناصر کے وجود کا باعث توانائی ہے۔

اور توانائی کا باعث کیا ہے؟

توانائی کو تو ازلی ابدی ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔ تمام حقیقتوں کی ابتدائی حقیقت جواز خود ہے اور کسی سے پیدا نہیں ہوئی۔ اگر یہی مان لیا جائے کہ ازل سے خلائے بسیط میں کچھ نہ تھا مگر توانائی تھی صرف توانائی، تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ توانائی کو پہلی بار مادہ میں کس علت نے تبدیل کیا؟

علت تو کوئی تھی نہیں لہٰذا یہ فرض کرنا پڑے گا کہ خود توانائی میں ہی یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ از خود بلا علت مادہ میں تبدیل ہوسکے یعنی یہ توانائی کی خاصیت ہے۔

اس خاصیت یا صلاحیت کو اضطراری قرار دیں گے یا اختیاری؟
مشاہدہ تو یہی بتاتا ہے کہ مادہ اور توانائی کی تمام شکلوں کے خواص اضطراری ہی ہیں کیونکہ وہ صرف معینہ ماحول اور علت کی موجودگی میں ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں اور لازماً ظہور پذیر ہوا کرتے ہیں۔لیکن توانائی کی مادہ میں پہلی تبدیلی کے لیے چونکہ نہ تو کوئی ماحول تھا اور نہ ہی علت اس لیے اسے اضطراری قرار دینا مشکل ہے۔اور اگر اسے اضطراری قرار دیا بھی جائے تو لازم آتا ہے کہ تمام کائناتی توانائی یکدم مادہ کی کسی ایک شکل میں تبدیل ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا اس لیے یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ تبدیلی اختیاری تھی۔کوئی منطقی طریق استدلال ہمیں یہ تسلیم کرنے پہ مجبور کرتا ہے کہ فضائے بسیط میں وہ ذاتِ واحد جو ازل سے تھی کائناتی توانائی ہے۔بدرجہ اقل جو صفات اس ذات میں ماننے پڑتے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ وحدہٗ لاشریک ذات ہمیشہ سے ہے،از خود ہے،اور کسی سے پیدا نہیں ہوئی،سب اس سے پیدا ہوئے ہیں۔وہ از خود اور اختیاری طور پر توانائی کی مختلف قسموں اور مادہ کی مختلف شکلوں میں تبدیل ہونے پر قادر ہے۔اور چونکہ اختیاری طور پر قادر ہے لہٰذا علیم بھی ہے۔اس کے علم،اختیار،ارادہ اور قدرت کو ہم کتنا ہی محدود رکھنے کی کوشش کریں ہم کسی نہ کسی حد تک علت اولیٰ یعنی کائناتی توانائی سے یہ صفات منسوب کرنے ہی پڑیں گے۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ کائناتی توانائی اِن صفات کی حامل نہیں لہٰذا کائناتی توانائی کو نہیں بلکہ اس کے پس پردہ کسی اور علتِ اولیٰ کو تسلیم کرنا منطقی طور پہ ناگزیر ہوگا جو اِن صفات کی حامل بھی ہو اور کائناتی توانائی کا مصدر بھی۔لادینی مادہ پرستی اس ٹھوس دلیل کا کوئی جواب نہیں دیتی۔

آیئے اب ذرا غور کریں کہ خواص الاشیاء کی ماہیت کیا ہے؟

خواص الاشیاء مادے کی مختلف انفرادی شکل سے ظاہر ہونے والی وہ خصوصیتیں ہیں جو کسی ایک شکل سے مختلف علتوں کے باعث مناسب ماحول میں یکساں طور پر اور لازماً ظاہر ہوا کرتی ہیں۔مثلاً ہائیڈروجن ایک گیس ہے اور جلتی ہے،آکسیجن بھی گیس ہے لیکن جلاتی ہے۔سوڈیم

ایک ٹھوس عنصر ہے جو پانی کو پھاڑ کر ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل کر دیتا ہے۔شکر پانی میں حل پذیر اور میٹھی شئے ہے اور کونین کڑوی۔سیب لذیذ اور فرحت بخش ہے لیکن سنکھیا سم قاتل ہے وغیرہ وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ اِن مختلف خواص کی علت کیا ہے؟ اور کیا اِن خواص کے تعین و تقسیم کے لیے کوئی قاعدہ قانون مقرر ہے؟ آکسیجن اور ہائیڈروجن دونوں ہی گیسیں ہیں لیکن پانی جو اِن سے مرکب ہے وہ جلنے کی بجائے جلنے والی ہر چیز کو بجھا دیتا ہے۔پانی مائع ہے تو کیوں مائع ہے؟ جب توانائی محض ایک محرک اور متحرک قوت ہے،صرف ایک بے قراری ہے تو اس کے ارتکاز سے جو مادہ پیدا ہوتا ہے اُس میں بھی انھی یا اس سے ملتے جلتے خواص کا مظہر ہونا چاہیے تھا کیونکہ کوئی نئی شئے یا کیفیت از خود وجود میں نہیں آسکتی پھر اس نے بالکل جدید اور مختلف خواص کا مظاہرہ کیسے شروع کر دیا؟

مختلف عناصر اگر اس وجہ سے مختلف ہوئے کہ اُن میں توانائی کی وحدتیں مختلف نسبتوں سے شریک تھیں تو اِن سے توانائی ہی کے خواص مختلف نسبتوں سے ظاہر ہونے چاہییں تھے یہ نئے نئے غیر متوقع اور ناقابل توجیہہ خواص کہاں سے آ گئے جن کے تنوع کی انتہا نہیں اور جن کی وضاحت کرنا سائنس دان ضروری نہیں سمجھتے۔کیا اِن کا مطالعہ اور اُن کی توجیہہ کی کوشش لادینی مادہ پرستی کا فرض نہیں۔اس سے گریز کا سبب کہیں لادینی مادہ پرستی کی بنیادی کمزوری تو نہیں؟

سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین کی طرف ہی کیوں گرتا ہے کبھی کبھی آسمان کی طرف کیوں نہیں چلا جاتا؟ یہ نہایت قدیم سوال ہے لیکن نیوٹن سے پہلے اس سوال کو درخور اعتناء کو نہیں سمجھا گیا۔ جب کبھی یہ سوال اٹھا اہل علم نے لوگوں کو نادان ٹھہرایا اور کہا یہ تو چیزوں کی خاصیت ہے کہ وہ زمین ہی طرف گرتی ہے اور ایسے سوال مہمل ہیں۔یہی جواب خواص الاشیاء کی علت دریافت کرنے والوں سے کیا گیا تو انھوں نے کہا یہ چیز تو خواص الاشیاء میں شامل ہے۔چنانچہ یہ سوال محتاج توجیہہ ہی رہا اسی طرح جس طرح کہ کوئی بیان نہیں کر سکا کہ مختلف اشیاء کے مختلف خواص

کا سبب کیا ہے اور یہ خواص کون سے قانون کے تحت متعین ہوتے ہیں۔ میٹھی چیز میٹھی اور کڑوی چیز کڑوی کیوں ہوتی ہے۔ سرخی، سبزی اور زردی کے امتیاز کی بنا کیا ہے؟ یعنی خواص الاشیاء کی علت کا راز کیا ہے؟ یہ ایک خالص علمی سوال ہے جس سے محض اس لیے گریز کیا جاتا ہے کہ یہ خیال خداشناسی کی طرف رہبری کرتا ہے۔ مختلف اشیاء میں مختلف خواص کی حقیقت کا مطالعہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خواص الاشیاء کی تقسیم بے مقصد اور بے ہنگم اندھی تقسیم نہیں بلکہ یہ تقسیم حیات کی مقصدیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ خود سائنس دانوں ہی کے بیان کے مطابق یہ خواص الاشیاء کی پر مصلحت تقسیم ہی کا نتیجہ ہے کہ خلائے بسیط میں ہیلیم اور ہائیڈروجن کی سادہ شکلوں سے آغاز کر کے کائنات نے شجر وحجر اور حیوان وانسان تک ترقی کی ہے۔ اگر خواص الاشیاء کا تعین اندھا دھند بے ربط اور غیر منظّم ہوتا تو ارتقائی منازل کی نوبت ہی نہ آسکتی تھی۔

چنانچہ توانائی اور مادے نے پہلے حیات کی آمد کے لیے کارساز ماحول فراہم کیا۔ مادے کی ایک مخصوص شکل پانی ہے جسے حیات کی بنیاد بننا تھا۔ چنانچہ پانی کو کائنات میں وافر مقدار میں فراہم کیا گیا۔ پانی کو ایسے خواص فراہم کیے گئے جو حیات کے لیے نہایت معاون ہیں۔ حرارت کی تھوڑی بہت کمی بیشی سے اُسے باآسانی زمین کے ہر حصے اور فضاؤں میں پہنچانے کی خاطر اس کے نقاط تبخیر وانجماد انتہائی موزوں رکھا گیا۔ قادر مطلق نے پانی کے قانون کو سمندری مخلوقات کی حیات کے الٹ دیا۔ چنانچہ نقطہ انجماد سمندروں کی پیداوار کے لیے ناموزوں نظر آیا تو صفر سینٹی گریڈ اور چار سینٹی گریڈ کے درمیان پانی کے خواص کو الٹ دیا گیا تاکہ برف ہلکی ہو کر سطح آب پر تیرتی رہے اور سمندر کی تہوں میں آبی جانور موت سے مامون رہیں۔ خواص الاشیاء کی ایسی تقسیم جب لامذہب محققین کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اسے ''قدرت کی ناقابل فہم فیاضی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

نگاہ تدبر ذرا اور گھمائیں اور وجودِ حیات پہ تفکر کریں کہ حیات نے اس امر کو واضح کر دیا کہ

نیوکلیک ایسڈ کو ایسے خواص بخشے گئے ہیں جو قیام حیات اور بقائے حیات کے ضامن ہیں۔
توالد وتناسل کے مادوں کو وہ محیر العقول اور ناقابل فہم خواص عطا کرنا جنھیں دیکھ دیکھ کر حیرت سے انسان کے اوسان خطا ہوں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قدرت بہر قیمت بقائے حیات پہ مصر ہے۔ چنانچہ سلسلہ توالد کو برقرار رکھنے کے لیے الفت ومحبت کی کشش پیدا کرنا اولاد کی پرورش کے لیے ماں باپ کے دل میں بچے کے لیے بے پناہ محبت ڈال دینا یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو غیر متعصب صاحب فہم کو بھی با مقصد تخلیق کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ محض خواص الاشیاء کے صدقہ میں حضرت انسان کا صاحب فہم وادراک بن جانا ہی قطعی طور پہ ثابت کرتا ہے کہ یہ ''منصوبہ بندی'' کسی کائناتی توانائی کے بس کا روگ نہیں بلکہ کسی ''صاحب تدبر و صاحبِ ارادہ ہستی'' کے امر کی کرشمہ سازی ہے۔
یہ بھی ایک برہنہ حقیقت ہے کہ کائناتی توانائی اور مادہ خواص الاشیاء کے پردے میں اضطراری قدرت کا بوجھ تو اٹھا سکتے ہیں مگر اختیاری قدرت، ذی ارادہ اور بامقصد ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف خواص الاشیاء کے ہی مظہر ہیں۔ وہ علم واختیار وارادہ ومصلحت اور کسی مقصد کے حامل نہیں ہو سکتے۔ لیکن جب اِن صفات کا وجود اسی مادی کائنات میں صاف طور پر کارفرما نظر آ رہا ہے تو اُن کے موصوف کی تلاش کرنا بھی منطقی مادہ پرستی کا فطری تقاضا ٹھہرا مگر مادہ پرستوں نے اس سے گریز کیا۔ اس لیے کہ یہ راہ تو سیدھی خدا کی طرف لے جاتی ہے اور اُس راہ سے فرار ہی تو اس مادی تخیل کی بنیاد ہے۔
چنانچہ اب یہ امر ثابت ہو چکا کہ مادہ اور توانائی کی علت اولیٰ بھی وہی ہے جس نے اس کائناتی توانائی کو پیدا کیا جو انسان کا رب ہے اسی نے روح حیات کو نفخ کیا اور اسی نے خواص الاشیاء کی تقسیم کی۔ کارخانہ قدرت میں ذرا سے غور پہ بھی مقصد زیست کا سراغ اپنی پوشیدگی کھونے لگتا ہے۔ اس منزل تک عقل کا پہنچنا دشوار نہیں کہ خالق نے جو ذی ارادہ، ذی فہم اور شرف سے معمور مخلوق انسان کی صورت پیدا کی ہے اُس کی تخلیق کے پیچھے اس سے بہتر اور کیا مقصد ہوگا

کہ جس طرح کائنات کا ذرہ ذرہ خالق کی اطاعت پہ مصر ہے انسان بھی اُن سے ہم آہنگ ہو جائے اور اپنے خالق کی منشا کے سامنے سر جھکا دے۔ یہی اہل مذہب کا استخراج ہے اور مارکس نے اسی کی نفی کی تھی۔ ذہن میں رہے کہ اہل مذہب نے مندرجہ بالا نتائج تک پہنچنے کے لیے صرف نظری استخراج پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ مادی سائنس کے ٹھوس اصولوں اور مادہ پرستوں کی منطق کے مطابق عملی مشاہدہ اور ذاتی مکاشفہ سے بھی پوری پوری رہنمائی حاصل کی ہے۔ چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ تمام ادیان کے ہادیوں نے اپنے اپنے ذاتی مشاہدہ سے اس بات کی شہادت پیش کی ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ برحق ہے۔

انبیائے کرام کے معزز گروہ نے ذات باری سے شرف تکلم حاصل کر کے اس کا مشاہداتی ثبوت فراہم کیا ہے اور اپنے منطقی استدلال اور مشاہداتی تصدیق کی بنا پہ ہی مذہب کی اشاعت کی۔ تمام انبیاء نے باری باری اس بات کی گواہی دی اور اسی بات پہ اپنے مذہب کی بنیاد رکھی کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامِ یعنی تسلیم و رضا اور کامل ہم آہنگی ہی دین فطرت ہے۔

پھر فرمایا اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰھِیْمَ وَ مُوْسٰی۔ یعنی پہلے انبیاء کی مقدس کتابوں میں بھی یہی مذکور ہے اور براہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی یہی لکھا گیا۔

مذہب اور خدا پرستی کی معقولیت کے یہ دلائل خود مذہب نے پیش کیے ہیں یہ کسی نئی روشنی کی تازہ تنویر نہیں۔ بلکہ وہ وہی قدیم صبح ازل کے بتائے ہوئے، روح القدس کے فرمائے ہوئے، نبی اُمی ﷺ کے پڑھائے ہوئے، چودہ سو چونتیس سال سے قرآن حکیم میں مستور و محفوظ دلائل ہیں جنھیں قرآن حکیم مختلف پیرائے میں بار بار دہراتا ہے اور مغربی تہذیب کے دلدادگان ہوں یا مارکسی نظریات کے حامی اُن کو باور کراتا ہے کہ اسلام خدا پرستی کی تعلیم کی بنیاد ڈرانے دھمکانے یا کسی لالچ پہ نہیں رکھتا بلکہ کائنات کے خالص منطقی مطالعہ پہ رکھتا ہے۔ اور قرآن حکیم

میں خوف ورجاء کا ذکر خدا شناسی کے لیے نہیں بلکہ قدرت کے قانونِ مکافات کی وضاحت کے لیے آیا ہے۔ کتاب مقدس میں ہمارے اس استدلال کے استحکام کے لیے بہت سی آیات ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں صرف کچھ ہی آیات پر نظر ڈالنے پہ اکتفاء کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ ص میں ارشاد فرمایا کہ:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًاؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ ز اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ ص 38 ؛ آیات 27-29)

ترجمہ:

”ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور اِس دنیا کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے فضول ہی پیدا نہیں کر دیا۔ یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا ہے، ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا ہم متقیوں کو اور فاجروں ایک جیسا کر دیں؟ یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تا کہ یہ لوگ اس کی آیات پہ غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق حاصل کریں“۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ حجر میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ ط وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ○ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ○

القرآن الحکیم (سورۃ حجر 15 ؛ آیات 84-86)

ترجمہ:

”ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پہ خلق نہیں کیا، اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے پس اے نبی تم شریفانہ درگزر سے کام لو یقیناً تمھارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے“۔

✡✡✡✡✡✡

اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَمَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ص تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ بقرۃ 2 ؛ آیات 164)

ترجمہ:

”جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی

چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے، زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، میں عقل والوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں"۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ص وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ج وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانبیاء 21 ؛ آیات 30-32)

ترجمہ:

"کیا وہ جو لوگ کفر کرنے والے ہیں غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ ہماری اس صناعی کو نہیں مانتے۔ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر

لیں اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا۔ مگر یہ لوگ ہیں کہ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ وہ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں"۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانحل 21 ؛ آیات 32-30)

ترجمہ:

"اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اُس نے تمھیں کان دیئے، آنکھیں دیں، اور سوچنے والے دل دیے، اس لیے کہ تم شکرگزار بنو"۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل 17 ؛ آیات 70)

ترجمہ:

”یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی بخشی اور انھیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں اور اُن کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پہ نمایاں فوقیت بخشی“۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ کہف میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَاقَدَّمَتْ يَدٰهُ ط اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا۝ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُوالرَّحْمَةِ ط لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ط بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا۝

القرآن الحکیم (سورۃ کہف 18 ؛ آیات 57-59)

ترجمہ:

”اُس سے بڑھ کے ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے اور وہ اُن سے منہ پھیر لے، اور اُس برے انجام کو بھول جائے جس کا سرو سامان اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہے اُن کے دلوں پہ ہم نے غلاف چڑھا دیئے ہیں جو انھیں قرآن کی بات سمجھنے نہیں دیتے ، اور اُن کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے۔ تم انھیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔ تیرا رب بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ وہ اُن کے کرتوتوں پر انھیں

پکڑنا چاہتا تو جلد ہی عذاب بھیج دیتا، مگر اُن کے لیے وعدے کا ایک دن مقرر ہے اور وہ اُس سے بچ کر بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے"۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ کہف میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ○ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا○

القرآن الحکیم (سورۃ کہف 18 ؛ آیات 45-46)

ترجمہ:

"اور اے نبیؐ انھیں حیاتِ دنیا کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسایا تو زمین کی پود خوب گھنی ہوگئی۔ اور کل وہی نباتات بھس بن کے رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے۔ یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی فائدے کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انھی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں"۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ حج میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا

خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ط وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ط وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ○ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ○ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ حج 22 ؛ آیات 5-10)

ترجمہ:

''اے لوگو! اگر تمھیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں ہم جس کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں، (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم

اپنی جوانی کو پہنچو۔اورتم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہےاور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے اُس پہ مینہ برسایا کہ یکا یک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگانی شروع کر دیں۔اور یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ اللہ ہی حق ہے،اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے وہ ہر چیز پہ قادر ہے ،اور یہی (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آ کے رہے گی،اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور اللہ ضرور اُن لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں۔ اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے خدا کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں۔تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے بھٹکا دیں۔ایسے شخص کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور قیامت کے روز اُن کو ضرور آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پہ ظلم کرنے والا نہیں"۔

✡✡✡✡✡✡

قرآن کی اِن چند آیات سے ہی کائنات کی رنگا رنگی اور انسانی زندگی کی مقصدیت واضح ہو جاتی ہے۔یہ امر کھل کے سامنے آجاتا ہے کہ نہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے اور نہ ہی انسان کو مادر پدر آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ وہ زندگی کی اس مہلت کو اپنی آرزوں کی بھینٹ چڑھا دے۔جیسا کہ مادہ پرستوں کے نظریہ حیات سے ظاہر ہو رہا ہے۔اس باب میں ہم نے ڈارون،فرائیڈ اور کارل مارکس کے مادی نظریات پہ بحث کی ہے جنھوں نے انسانیت کو بے منزل مسافرت کے اُس آزار کی طرف بلایا جس کے دوسرے سرے پہ فلاح و کامرانی کی کوئی منزل نہ تھی۔مغربی معاشروں کا سماجی انتشار

اس بات کی علامت ہے کہ جن نظریات کو انھوں نے بطور زیست اپنایا ہے وہ عقلی بنیادوں پہ استوار نہ ہوئے تھے۔ مغربی ممالک اور اشتراکیت کے نظریات سے متاثرہ ممالک کے معاشروں کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ چاہے وہ مادی برتری کو حاصل کر ہی چکے ہوں تب بھی وہ حقیقی خوش سے محروم ہی ہیں۔ اس لیے کہ حقیقی خوشی اور طمانیت کا براہ راست تعلق اُس روحانی نظم سے ہے جسے عرف عام میں مذہب کہا جاتا ہے اور یہ لوگ کسی نظریہ کسی اعتقاد کسی مذہب حتیٰ کہ کسی خالق سے بھی محروم ہیں جس سے وہ اپنے دل کے دکھ کہہ سکیں اور یہی ان کی حقیقی بدقسمتی ہے۔

✡ ✡ ✡

علم کا اسلامی تصور

حیات و کائنات کا مسئلہ پیچیدہ اور عمیق ہے مگر اُن فلاسفہ کے لیے جنھوں نے اسے جاننے کے لیے خالق کے وجود کی نفی کی ۔علم کے اسلامی تصور میں یہ معاملہ سادہ اور قابل فہم ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور کہا ہو جا اور یہ کائنات قائم ہوگئی۔حیات کے بارے میں اہل مغرب نے تخلیق انسان یعنی علم الانسان کی بنیاد جن قیاس آرائیوں پہ رکھی ہے اُن کی بنیاد قدیم زمانے کے کھنڈروں سے برآمد ہونے والی وہ چند ہڈیاں ہیں ، زمین کی تہوں سے نکلنے والی وہ کھوپڑیاں ہیں اور وہ چند ٹوٹے پھوٹے برتن ہیں جن پہ جدید علم عمرانیات کی بنیاد رکھی ہے۔جب کہ اسلام نے اس بارے میں جو تصور پیش کیا ہے وہ نہایت آسان سادہ اور سہل ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ میں زمین پہ اپنا خلیفہ اتارنے والا ہوں۔فرشتوں نے چند تحفظات کا اظہار کیا تو اللہ نے کہا کہ تم میرے پورے منصوبے سے آگاہ نہیں ہو۔ میں انسان کو

اختیار اور ارادہ کی آزادی دوں گا تو اس کی ہدایت کا اہتمام بھی کروں گا۔

چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا کہ!

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ○ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/30-33)

ترجمہ:

”پھر ذرا اُس وقت کا تصور کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں“۔ انھوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اُس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں کرے گا ؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں“ فرمایا: میں وہ جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جاتے“۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمھارا خیال صحیح ہے تو اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ انھوں نے عرض کیا۔ نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے ہم

تو بس اُتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو بتا دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے والا اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا تم اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب آدم نے اِن تمام چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے اسے بھی میں جانتا ہوں''۔

✡✡✡✡✡✡

اور اسی اہتمام کے پس پردہ علم کی وہ حقیقی اساس بیان کی گئی جس کی تلاش میں انسان نے صدیوں ٹھوکریں کھائیں۔ فلسفہ اور مادی علوم ایک طویل جہد و سعی کے بعد بھی جن مسئلوں کا کوئی حل پیش نہ کر سکے اللہ تعالیٰ نے اسے دو چار آیات کے ذریعے بیان کر دیا اور ساتھ ہی انسان کی منزل اور طریق عمل کو بھی متعین کر دیا۔ اسلام نے انسان کو جو تصورِ حیات دیا وہ اس نظریہ علم کے سراسر متضاد ہے جو قدیم اور جدید فلسفے نے پیش کیا۔ اسلام نے انسان کی زندگی کے اُس تسلسل کو بیان کیا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ قرآن نے ہمیں بتایا کہ موت جس کو بعض کم فہم زندگی کا اختتام جانتے ہیں وہ تو محض منظر کی تبدیلی کا نام ہے۔ موت کے بعد انسان کو ابدی حیات عطا کی جائے گی اور اِس دنیا کے اعمال کی بنیاد پہ اُس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کیا جائے گا۔

قرآن مجید میں ارشاد کیا گیا کہ!

كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَكُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡيَاكُمۡ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡكُمۡ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ○ هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ثُمَّ اسۡتَوٰٓى

اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰھُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَ ھُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/28-29)

ترجمہ؛

"تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اُس نے تم کو زندگی عطا کی ۔ پھر وہی تمھاری جان سلب کرے گا پھر وہی تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تمھیں پلٹ کے جانا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں ، پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے، اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

اس تصورِ حیات کے تحت ظاہر ہے کہ انسان کے لیے صرف وہی عمل نافع ہوسکتا ہے جو دونوں زندگیوں کو محیط ہو۔ جو اس زندگی میں بھی انسان کو آسانی اور راحت بہم پہنچائے اور موت کے بعد جو زندگی شروع ہونے والی ہے اُس میں بھی انسان کامیابی حاصل کرے۔ اسلامی نظریہ حیات اور مادی تصورِ حیات میں ایک قدر مشترک ہے کہ انسان نے بہرحال پوری زندگی کا کچھ حصہ اس دنیا میں بھی گزارنا ہے اس لیے اسلام اسلوبِ زیست کے لیے وضع کی گئی اُن مادی سہولیات کو رد نہیں کرتا جو انسان نے علم و عقل کی بنا پہ حاصل کی ہیں۔ وہ اس بات پہ یقین رکھتا ہے کہ عقل انسان کی راہنمائی کرتی ہے مگر وہ عقل کی ایک حد مقرر کرتا ہے اور اُسے استعمال کرنے کی ہدایت بھی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا کہ!

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَیۡنَیۡنِ ○ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ○ وَھَدَیۡنٰهُ

النَّجۡدَیۡنِ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ البلد 8-10/90)

ترجمہ؛

”کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور دونوں نمایاں راستے اسے دکھا نہیں دیئے“۔

✡✡✡✡✡✡

مزید ارشاد ہوا کہ!

اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ۝ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ۝ وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ الغاشیۃ 8-10/88)

ترجمہ؛

”کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیے گئے؟ اور آسمانوں (کو نہیں دیکھتے) کہ کس طرح اِن کو بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں، اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی ہے“۔

✡✡✡✡✡✡

آگے مزید ارشاد ہوا کہ!

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الۡبُکۡمُ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ الانفال 22/8)

ترجمہ:

"یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے"۔

✡✡✡✡✡✡

مزید ارشاد ہوا کہ!

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الحج 46/22)

ترجمہ:

"کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں، جس سے اِن کے دل ایسے ہو جائیں کہ وہ اِن سے سمجھ کا کام لینے لگیں یا اِن کے کان ایسے ہو جائیں کہ وہ اِن سے سننے کا کام لینے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ یہ دل ہیں جو سینے کے اندر اندھے ہو جاتے ہیں"۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ عقل وحواس کے ذریعے سے حاصل ہونے والے علم کی نفی نہیں فرماتا بلکہ صرف انسان کی توجہ اس جانب مبذول کراتا ہے کہ عقل سے راہ دیکھی جا سکتی ہے منزل کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح کہ انسانی تجربہ شاہد ہے کہ محض عقل وحواس سے حاصل ہونے والا

علم تو زندگی کے بارے میں بھی کبھی یکسو نہیں رہا بلکہ اُس کا نظریہ ہائے کار اور نظام ہائے فکر تبدیلیوں اور انتشار کا شکار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی مادی تعبیر پر ایمان رکھنے والے کبھی کسی ایک حل پہ اکٹھے نہیں ہوئے۔ آج کی دنیا ہی پہ نظر ڈال لیں انسانوں کا ایک بڑا گروہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے تحت زیست کر رہا ہے تو انسانوں کا ایک اور گروہ اشتراکی فلسفہ زیست پہ یقین رکھتا ہے۔ اسی طرح جدید دنیا میں کہیں تو فلاحی ریاست کا تصور پنپ رہا ہے تو کہیں جمہوری اقدار کو انسانیت کے مسائل کا حل قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ عقل اگرچہ اللہ تعالیٰ کا بیش بہا تحفہ ہے مگر انسان عقل و حواس کی بنا پر کبھی اُس ابدی سچائی (Absolute Truth) تک نہ پہنچ سکا جس کی طرف اُس کی رہنمائی علم وحی کے ذریعے کی گئی۔ لہٰذا عقل ہی انسان کی راہنمائی اس امر کی طرف کرتی ہے کہ علم کا کوئی ایسا ماخذ ضرور ہونا چاہیے جو عقل سے بلند تر ہو اور وہ عقل کا ہاتھ پکڑ کر اسے ابدی سچائی تک پہنچا دے۔

وحی کے ذریعے سے انسان تک جو علم منتقل کیا جاتا ہے وہ انسان کو دونوں جہانوں میں کفایت کرتا ہے جب کہ مادی نظام حیات اور نظریہ علم میں یہ صلاحیت بھی نہیں کہ وہ اس زندگی کے مسائل ہی کا کوئی ایسا حل پیش کر سکے جس پہ تمام انسانیت متفق ہو جائے اگر ایسا ممکن ہوتا تو پہلی اور دوسری جنگ عظیم جیسے وحشیانہ مناظر سے انسانی آنکھ نا آشنا ہی رہتی۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحی کا علم ہی علم حقیقی ہے اور دوسرے تمام علوم علم محض ہیں۔ وحی کے علم کی بنیاد خالق کی منشا پہ رکھی ہے اور وحی انسانوں کی راہنمائی اُن سنگ میل کی طرف کرتی ہے جو منزل کے خدوخال کی وضاحت کے لیے متعین کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کائنات کو پیدا کیا اور اُس کے لیے کچھ قوانین وضع کیے۔ پھر کائنات کی ہر چیز کو اِن احکامات کا پابند کر دیا گیا، کائنات کی ہر چیز اُسی حکم کے تابع ہو گئی جو اُس کے لیے خالق کی طرف سے متعین کیا گیا۔ چنانچہ سورج اپنے وقت پہ نکلتا ہے اور وقت پہ ہی ڈوبتا ہے اُس میں اتنی جرأت نہیں کہ کبھی ایک سیکنڈ کے لیے بھی دیر سے نکلے یا ایک سیکنڈ پہلے غروب ہو جائے۔ اسی طرح چاند پہاڑوں اور سمندروں کا معاملہ ہے کہ وہ اللہ کے احکامات کی تعمیل میں مگن ہیں اور انحراف کا اُن

کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا۔ اب انسان اور کائنات کی دیگر مخلوقات میں جو تفاوت ہے اُس کو سمجھ لیں کہ کائنات کی ہر مخلوق کو چاہے اُس کا تعلق جمادات سے ہو یا حیوانات سے ہو یا نباتات سے ہو براہ راست حکم دے دیا گیا کہ سرِ کائنات اُس کے ذمے کیا فرض ہے مگر انسان کو یہ حکم براہ راست نہیں دیا گیا بلکہ اُسے یہی حکم یعنی اطاعت کا حکم وحی کے ذریعے سے منتقل کیا گیا۔ انسان کو کائنات کی دیگر مخلوقات سے ممتاز پیدا گیا اور اسے یہ اختیار اور آزادی بھی دے گی گئی کہ اگرچہ درست راستہ تو وہی ہے جس کی تعلیم انسان کو اللہ کے پیغمبر دیتے ہیں جو اُن پہ وحی کی جاتی ہے۔ تاہم اگر انسان چاہے تو وہ اس سے انحراف کی راہ بھی اختیار کر سکتا ہے اگرچہ اس راہ میں اُس کے لیے کوئی خیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پہ مزید احسان یہ کیا کہ اُن کی ہدایت کے لیے انھی میں سے رسول بھیجے جو اُنھیں خالق کی منشا سے آگاہ کرتے رہے۔ اگرچہ انسان اکثر و بیشتر شکر کی راہوں سے گریزاں ہی رہا ہے۔ بعض لوگوں نے علم وحی پر بھی شبہ کیا ہے اور وہ علم کی اس ماہیت سے انکاری ہیں۔ ایسے لوگ قدیم زمانوں ہی سے چلے آ رہے ہیں اور جب بھی اللہ نے کسی قوم کی طرف اپنا پیغمبر اتارا ہے تو اول اول لوگوں نے اُس کا انکار ہی کیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے اللہ کے رسول ہمیشہ غالب رہے ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ پہ بھی اہل قریش نے یہ الزام عائد کیا کہ جو کلام وہ ہمیں سناتے وہ اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ وہ کسی سے سیکھ لیتے ہیں اور ہمیں سنا دیتے ہیں اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یوں دیا:

اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ۚ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ‌ۚ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۚ وَرُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ‌ؕ

القرآن الحکیم (سورۃ النساء 5/ 163-164)

ترجمہ:

''اے نبی! ہم نے تمھاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اُس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔ہم نے ابراہیمؑ اسماعیلؑ، اسحٰق و یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب، عیسی، ایوب، یونس ہارون اور سلیمان کی طرف بھیجی تھی۔ہم نے داؤد کو زبور دی، ہم نے اُن رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اِن رسولوں پہ بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا گیا''۔

✡✡✡✡✡✡

اسلام کے نزدیک سب سے اعلیٰ ترین علم تو وحی کا علم ہی ہے۔باقی سب علوم جن کے لیے ہم مادی علوم کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں انسان نے اپنی خواہش نفس سے گھڑ لیے ہیں اِن علوم کی بھی کئی اقسام ہیں اِن میں سے بعض علوم تو وہ ہیں جو براہ راست خالق کی منشا کی ضد ہیں۔ جیسے کہ سرمایہ دارانہ نظام زیست یا اشتراکیت کا فلسفہ زیست۔اور بعض علوم ایسے ہیں جس سے انسانیت فائدہ حاصل کرتی ہے۔اسلام اِن علوم کا انکار نہیں کرتا بلکہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اِن علوم کو اُن اصول و ضوابط کے تابع بنا دیا جائے جس میں خالق کی منشا ہے۔علم وحی کو دوسرے علوم سے ممتاز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اسے ''العلم'' قرار دیا ہے۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 18/3)

ترجمہ:

”فرشتوں اور اہل علم (اولوالعلم) کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل و قسط کو قائم رکھنے والا ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ غالب اور حکمت والا ہے“۔

✡✡✡✡✡✡

بیسویں صدی کے ممتاز مفسر مولانا امین احسن اصلاحیؒ (1904-1997ء) اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تدبر قرآن میں لکھتے ہیں۔

”العلم قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ علم حقیقی ہوتا ہے جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعے دنیا کو ملا ہے۔ اس علم کے حاملین نے ہر دور میں خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی ہے۔ یہ مصلحین و مجددین کے اُس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں اور جنھوں نے اللہ کے دین کو بدعات اور آمیزشوں سے پاک کر کے عقائد کو توحید خالص کی بنیاد پر شرائع و قوانین اور اعمال و اخلاق کو حق و عدل کی اساس پر استوار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ حکمت دین کا یہ نقطہ ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ اور ملائکہ کے ساتھ حاملین علم کا حوالہ ہے اور توحید کے ساتھ عدل و قسط کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اہل علم کا کیا مقام ہے اور خدائی شریعت کے نظام میں عدل و قسط کا کیا درجہ اور مقام ہے۔ علم حقیقی حاملین ملائکہ کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں“۔ (22*)

✡✡✡✡✡✡

قرآن مجید میں صاحب علم لوگوں کے ” **راسخون فی العلم** “ کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ!

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا۝

القرآن الحکیم (سورۃ النساء 162/4)

ترجمہ؛

''البتہ اِن میں جو علم میں راسخ اور صاحبِ ایمان ہیں' وہ ایمان لاتے ہیں اُس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی اور خاص کر نماز قائم کرنے والے اور روزِ آخرت پہ یقین رکھنے والے' یہ لوگ ہیں جن کو ہم اجرِ عظیم سے نوازیں گے''۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات کا ترجمہ اور تشریح بھی تدبرِ قرآن سے تحریر کی جاتی ہے۔ امام امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں کہ!

''**راسخون فی العلم** سے مراد یہاں وہ علماء ہیں جن کے قدم شریعت میں خوب جمے ہوئے ہیں' جو عقیدہ اور عمل ہر چیز میں راسخ اور کردار و اخلاق' ہر پہلو سے جادۂ مستقیم پر استوار تھے۔ یہود میں علماء کم نہیں تھے' بے شمار تھے لیکن شریعت اِن کے لیے بس ایک نمائشی جامے کی حیثیت رکھتی تھی۔ جسے پہن کر وہ باہر بازاروں اور عوام میں نکلا کرتے تھے۔ اِن کے فکر و نظر اور اِن کے قلب و روح سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ علماء تمام جرائم میں اپنی قوم کے ساتھ نہ صرف شریک تھے بلکہ وہی اِن امور میں اُن کے مرشد تھے' اس وجہ سے اِن سے اگر کسی چیز کی توقع کی جا سکتی تھی تو صرف اس چیز کی کہ وہ قرآن اور پیغمبر ﷺ کی مخالفت میں اپنی قوم کی

پیشوائی کریں۔البتہ اِن میں جونفوس قدسیہ حکمتِ دین کی لذت سے آشنا تھے اُن کے قدم علم شریعت میں راسخ تھے۔اس وجہ سے اُن کو اپنی قوم کی متفقہ مخالفت کے طوفان کے مقابلے کے لیے کھڑا ہونے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی۔ یہاں انھی نفوس قدسیہ کو عام علمائے یہود سے ممتاز کرنے کے لیے علما کی بجائے "**راسخون فی العلم**" کے لقب سے مشرف فرمایا ہے۔یعنی یہ آندھی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رخ اڑنے والے نہیں ہیں بلکہ چٹانوں کی طرح اپنے موقف حق پہ جمے رہنے والے ہیں"۔(23*)

✡✡✡✡✡✡

علم کے بارے میں ہمارا موقف اب قدرے واضح ہو کے سامنے آچکا ہے کہ ہم علم کی صرف اُسی صورت کو علم حقیقی کا درجہ دیتے ہیں جو خالق کی طرف سے اپنی مخلوق کی طرف وحی کی صورت اتارا جاتا ہے۔ باقی علوم سے ہم انکاری نہیں اور نہ اِن کی افادیت سے انکاری ہیں۔تاہم وہ علوم جو خالق کی رضا کے خلاف ہوں اُن کو بہر حال ہم علم کی کوئی صورت تسلیم کرنے کو تیار نہیں بلکہ وہ اُس عقلی جہالت کے نشانات ہیں جہاں جہاں انسان نے علم کی جستجو میں ٹھوکر کھائی۔ چنانچہ جب علم وحی باقی تمام علوم سے برتر ثابت ہوا تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پہ حاملین وحی کو دوسرے تمام لوگوں پہ برتری حاصل ہونی چاہیے۔اگر حقیقت اس کے برعکس ہے تو وہ اُس انحراف اور بے اعتنائی کا لازمی نتیجہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔حالانکہ یہی قرآن ہے جس کی تعلیمات کے بل بوتے پر اُس نے ہزار سال تک خطہ ارض پہ حکومت کی ہے۔حاملین وحی کی تین اقسام ہیں،اول تو انبیاء و رسل ہیں جن کی طرف براہ راست وحی کی جاتی ہے۔انبیاء کا علم راسخ ہوتا ہے اور اُس میں کسی شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ازاں بعد حاملین وحی کا دوسرا گروہ وہ ہے جو علم وحی کی تشریح کرتا ہے علم کے اُس نور کے سائے میں فقہ و شریعت کے قوانین وضع کرتا ہے۔اصطلاح میں اِن کو علماء فقہا کہا جاتا ہے۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو عام مسلمانوں پہ مشتمل ہے جنھوں نے اُن امور کی پیروی کرنی ہوتی ہے جن کو

حاملین وحی نے واضح کیا ہو۔انحراف اور بے اعتنائی کا سب سے زیادہ داعیہ اسی طبقے میں پایا جاتا ہے کہ یہی طبقہ اکثریت میں ہوتا ہے۔وحی کی ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حیوانات و جمادات پہ اتارا ہے۔تاہم یہ اُس وحی سے قدرے مختلف ہے جو انسان کی طرف کی جاتی ہے ۔انسان اور جانور کے مابین کی جانے والی وحی کے باہمی تفاوت کو جاننے کے لیے مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن پہ ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔سورۃ النحل کی تفسیر کرتے ہوئے مرشد مودودیؒ نے لکھا ہے۔ پہلے آیات پہ ایک نگاہ ڈال لیں۔

وَاَوۡحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ○ ثُمَّ كُلِیۡ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُكِیۡ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِهَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ فِیۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَكَّرُوۡنَ○

القرآن الحکیم (سورۃ النحل 68-69/16)

ترجمہ؛

”اور دیکھو تمھارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پہ چلتی رہ۔اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے“۔

✡✡✡✡✡✡

اِن ایات کی تفسیر میں سیّد ابولاعلی مودودیؒ تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

"وحی کے لغوی معنی خفیہ اور لطیف اشارے کے ہیں' جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا اور کوئی محسوس نہ کر سکے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ "القاء" (دل میں ڈال دینے) اور الہام (مخفی تعلیم و تلقین) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی مکتب و درسگاہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقوں سے دی جاتی ہے کہ بظاہر نہ کوئی تعلیم دیتا نظر آتا ہے نہ تعلیم پاتا۔ اس لیے اس کو قرآن میں وحی' الہام اور القا کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں لفظ الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ لفظ وحی انبیاء کے لیے مخصوص ہو گیا ہے، الہام کو اہل علم اور بندگانِ خاص کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور القا کی نسبت عام ہے۔ لیکن قرآن میں یہ اصطلاحی فرق نہیں پایا جاتا یہاں آسمانوں پہ بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق اس کا سارا انظام چلتا ہے (دیکھیں سورہ حم سجدہ) زمین پر بھی وحی کی جاتی ہے جس کا اشارہ پاتے ہی وہ اپنی سرگزشت سنانے لگتی ہے۔

(دیکھیں سورہ الزلزال) ملائکہ پہ بھی وحی کی جاتی ہے جس کے مطابق وہ کام کرتے ہیں (دیکھیں سورۃ الانفال)۔

اور شہد کی مکھی کو اُس کا پورا کام فطری تعلیم کے ذریعے سمجھایا جاتا ہے، اور یہ وحی صرف شہد کی مکھی تک محدود نہیں، مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اڑنا اور نوزائیدہ بچے کو دودھ پینا بھی وحی خداوندی ہی سکھاتی ہے۔ پھر انسان کو غور و فکر تحقیق و تجسس کے بغیر جو صحیح تدبیر یا صائب رائے یا فکر و عمل کی صحیح راہ سمجھائی جاتی ہے وہ بھی وحی ہے۔

(دیکھیں سوہ القصص)۔

اور وحی کی اس شکل سے کوئی بھی انسانی دل محروم نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے بھی اکتشافات ہوتے ہیں، جتنی بھی مفید ایجادات ہوتی ہیں، بڑے بڑے مدبرین، فاتحین، مفکرین اور مصنفین نے جو معرکے کے کام کیے ہیں اِن سب میں اس وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آئے دن اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی یونہی بیٹھے بیٹھے دل میں ایک بات آئی یا کوئی تدبیر سوجھ گئی یا خواب میں کچھ دیکھ لیا اور بعد میں تجربے سے پتہ چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو انھیں غیب سے عطا کی گئی۔ اِن بہت سی اقسام میں ایک خاص قسم کی وحی ہوتی ہے جس سے انبیاء علیہ السلام نوازے جاتے ہیں۔ اور یہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کیے جانے والے کو پورا شعور حاصل ہوتا ہے کہ یہ وحی اُسے خدا کی طرف سے کی جارہی ہے اور اسے اس کے من جانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ وہ عقائد احکام قوانین اور ہدایات پہ مشتمل ہوتی ہے اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی کے ذریعے سے نوع انسانی کی رہنمائی کی جاسکے۔ (24*)

✡✡✡✡✡✡

وحی کے بعد عقلی علوم کا درجہ ہے جو انسان عقل و حواس سے غور و فکر اور تحقیق و جستجو کے بعد حاصل کرتا ہے۔ اسی مقام پہ مغربی مفکرین نے ٹھوکر کھائی ہے کہ وہ عقلی علوم کو علم کا آخری درجہ قرار دیتے ہیں جبکہ عقل و حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے علوم علم وحی کے تابع ہیں یا علم کے وحی کے بعد ہیں۔ اللہ تعالیٰ عقل و حواس سے حاصل ہونے والے علوم کی نہ صرف حوصلہ افزائی فرماتے ہیں بلکہ انسان کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ مظاہر کائنات پہ نگاہ کرے اور تفکر و تدبر کے ذریعے خالق کی رضا کو تلاش کرے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ○ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ○ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البلد 8-10/90)

ترجمہ:

''کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور دونوں نمایاں راستے اسے دکھا نہیں دیئے''۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَهُوَ الَّذِىٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ المومنون 78/23)

ترجمہ:

''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو''۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

اِن آیات سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو جو آنکھیں اور کان دیئے ہیں اُن کا مقصد محض بولنا اور سننا نہیں ہے بلکہ یہ اصلاً علم کے وہ ذرائع ہیں جن سے کام لے کر انسان کو اللہ کی رضا تلاش کرنی چاہیے۔ ہم آنکھوں سے بدلتے منظروں کو دیکھتے ہیں، کانوں سے بدلتے نظریات کو

سنتے ہیں۔جس سے حق سچ کے مابین تفاوت کھل کے سامنے آجاتا ہے۔خیروشر کے بیچ کا فرق ظاہر ہوجاتا ہے جس کی بنا پہ انسان خیروشر کی دونوں راہوں کو شناخت کر لیتا ہے اور اِن میں سے کسی ایک راہ کو اپنے ارادے اور طبع کے باعث اختیار کر لیتا ہے۔چنانچہ سماعت و بصارت اللہ کی وہ نعمتیں ہیں جن سے کام لے کر انسان حق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔مگر جیسا کہ قرآن حکیم ہی میں اس امر کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر چہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں مگر وہ کفرانِ نعمت کرتا ہے اور آنکھیں ہونے کے باوجود حق نہیں دیکھتا، کان ہونے کے باوجود حق نہیں سنتا، دل ہونے کے باوجود غور نہیں کرتا۔اگر وہ اِن نعمتوں کو معرفت سے حقائق تک رسائی کے لیے استعمال کرتا تو حق کو پہچان جاتا۔اِن نعمتوں سے حاصل ہونے والی معلومات کی بنیاد پہ غوروفکر کرتا اور ان سے نتائج اخذ کرتا تو حق کسی شفاف آئینے کی طرح اس پہ آشکار ہوجاتا۔

تاہم ساتھ ہی قرآن حکیم نے اسی آیت میں فرمادیا کہ "**قَلِیْلاً مَّا تَشْکُرُوْنَ**" کہ انسان کم ہی شکر کی راہوں پہ چلتا ہے۔یعنی ایسے لوگوں کی تعداد ہمیشہ قلیل ہی رہی ہے جنھوں نے اِن نعمتوں کو اُس طرح استعمال کیا کہ اِن نعمتوں کا حق ادا ہوجائے اور وہ آنکھوں کانوں اور دل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشیاء کی حقیقت اور پھر اپنی ذات اور کائنات پہ نگاہ تدبر ڈال سکے۔قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ آفاق والنفس میں پھیلے ہوئے یہ مظاہر اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ بعض نشانیاں ہیں جو انسان کو اُس کے خالق تک لے جاتی ہیں۔اب ظاہر ہے کہ کائنات میں ہر قدم پہ پھیلی اللہ تعالیٰ کی بسیط نشانیوں کو صرف وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جو اِن نعمتوں کا حق ادا کرنے کا شعور رکھتے ہوں۔ورنہ سورج روز نکلتا ہے رات روز آتی ہے۔مگر ایک جاہل اور اجڈ چرواہے کے لیے اس میں غوروفکر کی کوئی بات نہیں۔اس کے برعکس ایک عالم کے لیے دن اور رات کا یہ تسلسل ہی خدا تک پہنچنے کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔قرآن حکیم میں ایسے لوگوں کی تحسین کی گئی ہے جو افاق والنفس کی نشانیوں پہ غور کرتے ہیں اور اپنے مالک کی صناعی پہ کھل اٹھتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ!

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 190-191/3)

ترجمہ:

”زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور کرتے ہیں (تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں) کہ پروردگار تو نے یہ سب کچھ (کائنات) فضول اور بے مقصد نہیں بنایا، اور تو پاک ہے اس سے کہ تُو کوئی عبث کام کرے پس اے رب تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے“۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات کی تشریح میں علماء نے لکھا ہے کہ جب انسان مظاہر کائنات پہ نگاہ تدبر دوڑاتا ہے تو وہ کائنات وحیات کی وجودیت کے بارے میں اُس تصور کے متعلق جان جاتا ہے، حق تک پہنچ جاتا ہے جس تک پہنچنے میں اہل فلسفہ نے پانچ ہزار سال تک اپنا سر زمین سے ٹکرایا ہے مگر اُن سے یہ راز مخفی ہی رہا۔ آیت کے آخری حصے سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ یہ توفیق انھی صاحبِ دانش لوگوں کو ارزانی فرماتا ہے جو اُس کے شکر گزار بندے ہوتے ہیں۔ جو اُس سے التجا کرتے ہیں کہ وہ

انھیں دوزخ کے عذاب سے بچالے جو اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ خالق نے کائنات میں یہ جو رنگ بکھیرے ہیں تو یہ محض اسی لیے ہیں کہ انسان اُن کے ذریعے خالق کے در تک جا پہنچے۔اہل مغرب کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ کائنات وحیات کی توجیہ کرتے ہوئے خالق سے بے اعتنائی کا رویہ اپنایا ہے۔اگرچہ انھوں نے عقل کا نعرہ لگایا مگر ہمیشہ اپنے اندر سے اٹھتی عقل کی اُس گواہی کا گلا گھونٹ دیا جو انھیں سچ تک لے جانا چاہتی تھی۔اس لیے حقیقت میں عقلیت پسندوں نے عقل کی آواز پہ کان نہیں دھرے بلکہ اپنے نفس کی پکار کے آگے سر جھکایا ہے۔چنانچہ میرے نزدیک عقلیت پسندی کی اصطلاح ہی سرے سے غلط ہے۔میرے خیال میں مغربی فلاسفہ کو نفس پرست کہنا چاہیے۔کیونکہ علم کا تو براہ راست تعلق عقل کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ اللہ سے وہی ڈرتا ہے جو علم والا ہے۔

”اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓوا ط اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ غَفُوۡرٌ O

القرآن الحکیم (سورۃ فاطر 28/35)

ترجمہ؛

”اللہ کے بندوں میں سے وہی اس سے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں، بے شک اللہ غالب اور ڈرانے والا ہے“۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

چنانچہ ثابت ہو گیا کہ اہل مغرب کے فلاسفہ عقل والے نہیں بلکہ نفس والے ہیں اگر وہ عقل والے ہوتے تو اللہ سے ڈرنے والے ہوتے۔آیت بالا پہ مفسرین کی تشریحات دیکھتے ہوئے مجھے سب

عمدہ بیان مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا لگا چنانچہ تدبر القرآن میں وہ لکھتے ہیں کہ!

''ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو محض ظاہر پرست ہوتے ہیں۔محسوسات سے آگے نہ اُن کو کچھ نظر آتا ہے اور نہ اس سے آگے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے اندر ظاہر اور باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو اپنے بطن و فرج کے مطالبات سے زیادہ اہمیت اپنی عقل اور روح کے مطالبات کو دیتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور اللہ کے رسولوں کی دعوت اِن کو اپیل کرتی ہے۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحیح علم کا منبع درحقیقت اللہ کی معرفت ہے جس کو خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوگی وہ علم سے بالکل محروم ہے۔اگرچہ وہ دنیا جہاں کی کتابیں حفظ کرڈالے۔اس طرح یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس کو خدا کی معرفت حاصل ہے۔اس کے اندر لازماً خدا کی خشیت بھی ہوگی۔اگر کوئی خدا کی خشیت سے محروم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کی معرفت سے بھی محروم ہے۔یہی معرفت اور خشیت انسان کے تمام علوم وافکار میں حقیقی زندگی پیدا کرتی ہے جس سے علوم وفنون دنیا کے لیے موجب خیر و برکت بنتے ہیں۔اگر یہ چیز نہ ہو تو انسان کی ساری ذہانت شیطان کی مقصد برآوری میں صرف ہوتی ہے اور بالآخر تباہی کا موجب بنتی ہے۔(25*)

✡ ✡ ✡

علم حقیقت، علم مجاز

یہاں ہم علم کے مختلف پہلوؤں سے بحث کر رہے ہیں۔علم کی حقیقت اور ماہیت پہ غور کر رہے ہیں۔حیات و کائنات کے اسراروں پہ غور فکر کر رہے ہیں۔اِن مضامین میں علم کے مختلف پہلو زیر بحث رہے ہیں جن سے یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ علم کی اگر چہ بیشمار اقسام ہیں مگر حقیقت میں علم کی اقسام دو ہی ہیں۔"مادی علوم اور روحانی علوم" علم کی انھی دو اقسام پہ کچھ لب کشائی یہاں مقصود ہے۔بعض لوگوں کو یہ شبہ گزرا ہے کہ اسلام مادی علوم کے سراسر خلاف ہے اور جو کچھ بھی انسان نے حواس و عقل سے حاصل کیا ہے اسلام اُسے رد کرتا ہے۔یہ ایک فکری مغالطہ ہے جس کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں۔اسلام دراصل صرف یہ کہتا ہے کہ انسان کو دنیا میں جو بھی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور تسخیر کائنات کے ضمن میں انسان نے جو بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں اُن کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اسلام کو اس پہ کوئی اعتراض نہیں مگر اُس کے نزدیک یہ مقصود بالذات نہیں یعنی انسانی شرف کی کوئی حقیقی منزل نہیں کہ وہ ستاروں پہ کمندیں ڈالے یا چاند پہ چہل قدمی کرے۔قرآن انسان کی تگ و دو اور جہد و

سعی کا مدار متعین کرتا ہے اور اُنسان کی راہنمائی اُس کو ہر مراد کی طرف کرتا ہے جو مقصود بالذات ہے۔اب اسی بات پہ غور کر لیں چاند پہ اترنے والے پہلے انسان خدا کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے تھے۔کچھ بھی نہیں وہ خدا کے وجود سے ہی انکاری تھے تو انھیں خدا کی اس مخلوق چاند پہ اتر کے بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ نہ انھوں نے معرفت کی کوئی منزل طے کی نہ خالق کی ہیبت سے اُن کے دل لرزے۔اس لیے کہ اُن کی تعلیم و تربیت ہی اس انداز میں کی گئی تھی کہ وہ چاند کو محض ایک مادی وجود تصور کرتے ہیں جو ایک متعین نظام کے تحت اپنے محور کے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔

علم کی یہی وہ اقسام ہیں جنھوں نے انسان میں دو ہی قسم کے ذہنی رویوں کو پروان چڑھایا۔آیئے اِن کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کرتے ہیں۔اِن میں سے ایک رویہ تو وہ ہے جو مادی زندگی میں حاصل ہونے والی کامیابیوں اور مال و متاع ہی کو اصل قرار دینے سے پیدا ہوتا ہے۔اور دوسرا رویہ وہ ہے جس میں انسان حقیقت تک رسائی کے لیے اللہ کی اطاعت اور اُس کے رسولوں کی پیروی اختیار کرتا ہے جو اسلام میں مطلوب ہے۔قرآن حکیم میں اِن دونوں رویوں پہ تاریخی کرداروں کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔قرآن نے قارون کو مادی نظام زیست کا نمائندہ قرار دیا ہے۔قارون اللہ ہی کا ایک بندہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے بے پناہ نواز رکھا تھا۔

بیان کیا گیا ہے کہ اُس کے خزانوں کی محض کنجیاں کئی اونٹوں پہ لادیں جاتی تھیں۔قارون کو اپنی دولت پہ بہت ناز تھا۔لوگ اُس کو کہتے کہ اس مال و دولت پہ مت اتراؤ بلکہ اللہ نے تمھیں جو کچھ عطا کیا ہے اس کا شکر ادا کرو اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو اور آخرت کی کامیابی کے لیے کوشش کیا کرو۔اس مال سے میں اگر تم اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرو گے تو موت کے بعد تمھیں اس کا فائدہ پہنچے گا۔مگر قارون بھی شاید نظام سرمایہ داری کا تربیت یافتہ تھا وہ لوگوں کو جواب دیتا کہ یہ کثیر مال و متاع جو تم دیکھتے ہو یہ میں نے اپنی محنت اور ذہانت سے حاصل کیا ہے۔اس میں اللہ کی رحمت کو کوئی دخل نہیں اس لیے میں اللہ کی راہ میں کیوں خرچ کروں۔قارون کو معاشرے میں بہت شان و شوکت حاصل تھی لوگ اُس کے عظیم مال و متاع کو دیکھتے تو اُن میں سے کچھ کہتے۔

”کاش ہمیں بھی قارون کی طرح دولت حاصل ہوتی“

کچھ اور لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ نے علم والے کہہ کے پکارا ہے قارون کو دیکھتے تو کہتے:

اللہ کے ہاں تو اس کی کوئی حیثیت نہیں اُس کا اجر قارون کے خزانوں سے کہیں بڑھ کے ہے۔

یہ دو نقطہ ہائے نظر تھے اور انھی میں سے اول کو مادیت پسندی اور دوم کو حقیقت پسندی قرار دیا گیا ہے۔قرآن نے تاریخ عالم سے اس کے نظائر اس لیے پیش کیے تا کہ انسان جان جائے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام حیات اور یہ اللہ تعالیٰ کی رضا پہ سر جھکا دینے کا نظریہ یعنی اطاعت کی روش، کوئی نئے اور انوکھے نظام فکر نہیں ہیں بلکہ زمانہ قدیم سے ہی انسانوں کا ایک گروہ شیطان کی پیروی میں محو ہے اور اپنے نفس کی پکار کے آگے سر جھکائے ہوئے ہے۔اور انسانوں کا ایک گروہ زمانہ قدیم سے ہی اللہ تعالیٰ کی رضا پہ صبر کرنے والا چلا آیا ہے۔اُس کے رسولوں کا مددگار رہا ہے۔اب قارون ہی کو دیکھیں کہ بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق تو وہ حضرت موسیٰ کا چچازاد تھا اور حضرت موسیٰ اس کی تربیت کا پورا اہتمام بھی کرتے تھے مگر اُس کی ایک ہی رٹ تھی کہ یہ مال و متاع اس کے زور بازو کی کمائی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہ پرلے درجے کا بخیل بھی تھا اور یہ ایک نظریہ حیات ہے جسے قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ارشادِ باریٰ تعالیٰ ہے کہ!

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۝

القرآن الحکیم (سورة القصص 28/79-80)

ترجمہ:

''وہ (قارون) پوری شان شوکت کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا تو جو لوگ حیات کے طالب تھے انھوں نے کہا: کاش! ہمیں بھی وہی کچھ حاصل ہوتا جو قارون کو حاصل ہے۔ بے شک وہ بڑے ہی نصیب والا ہے۔ اور جن لوگوں کو علم عطا ہوا تھا انھوں نے کہا: شامت زدو! ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے خدا کا اجر اس سے کہیں بڑھ کے ہے اور یہ حکمت صرف صابروں ہی کو عطا ہوتی ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

یہاں کچھ اُن لوگوں کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے جو مادیت پہ یقین رکھتے ہیں اور قارون کے نظریہ حیات کو لوگ خاص طور سے اہل مغرب آج تک سینے سے لگائے چلے آ رہے ہیں۔ اِن لوگوں نے اپنے نفس کی اس کجی کو کئی خوبصورت نام دے رکھے ہیں کبھی وہ خود کو مہذب اور تہذیب یافتہ کہتے ہیں تو کبھی آزاد خیال اور روشن خیال کہتے ہیں، کبھی وہ خود دین انسانیت کا پیرو کار بتاتے ہیں تو کبھی سرمایہ کار نظام زیست اُن کی متاع فخر بن جاتی ہے۔ تاہم مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی مال و متاع کے متعلق اہل علم کے نقطہ نظر سے بھی آگاہ کر دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو صبر کرنے والے ہیں خالق کی رضا پہ راضی رہنے والے ہیں اور اِن کے دل اس یقین سے مزین ہیں کہ انھیں جو نعمت حاصل ہے وہ اللہ ہی کی رضا سے حاصل ہوئی ہے اور جو نعمت اِن سے روک لی گئی ہے اللہ ہی اُس کو عطا کرنے والا ہے اور یقیناً اِس میں خالق کی کوئی مصلحت ہوگی جو اُس نے اِن کو آزمائش میں ڈالا ہے اور قارون جیسا مال و متاع اِن کو حاصل نہیں ہوا۔ دوسری طرف اہل ایمان کے اس تخیل کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اہل ایمان کو اس بات کی کوئی خاص پراوہ بھی نہیں ہوتی کہ اُن پہ اللہ کی نعمت تمام کیوں نہیں ہوئی اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اُن کے صبر کا پھل آخر اُن کو حاصل ہو کے رہے گا چاہے اِس دنیا میں چاہے تو اُس دنیا میں، اور انھیں اِس دنیا سے زیادہ اُس دنیا کا خیال ہے

کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا تو چند روزہ ہے اور دوسری دنیا ابدی ہے جہاں نہ نعمت کو زوال ہے نہ اُس کی رحمت کم ہوگی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے حقیقی علم کا نمائندہ سیّدنا داؤد علیہ السلام اور اُن کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کو قرار دیا ہے کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت سے بھی نوازا، مال ومتاع سے بھی نوازا، بادشاہی سے بھی نوازا بلکہ اُس بادشاہی سے نوازا جس کی مثال نہ تاریخ عالم سے کل مہیا کی جاسکتی تھی اور نہ ہی آج اُن کی مثل کوئی جلیل القدر بادشاہ خطہ ارض پہ موجود ہے کہ ہوائیں اُن کے حکم سے چلتی تھیں، شیاطین اور جن اُن کے غلام بنا دیئے گئے تھے، پرندے اُن کا حکم مانتے تھے۔ قرآن حکیم میں اُن کی اس عظیم بادشاہت کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ اِذۡ یَحۡکُمٰنِ فِی الۡحَرۡثِ اِذۡ نَفَشَتۡ فِیۡهِ غَنَمُ الۡقَوۡمِ وَ کُنَّا لِحُکۡمِهِمۡ شٰهِدِیۡنَ ○ فَفَهَّمۡنٰهَا سُلَیۡمٰنَ وَ کُلًّا اٰتَیۡنَا حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا وَّ سَخَّرۡنَا مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ یُسَبِّحۡنَ وَ الطَّیۡرَ وَ کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ○ وَ عَلَّمۡنٰهُ صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ لَّکُمۡ لِتُحۡصِنَکُمۡ مِّنۡۢ بَاۡسِکُمۡ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ شٰکِرُوۡنَ ○ وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَةً تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِهٖۤ اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا وَ کُنَّا بِکُلِّ شَیۡءٍ عٰلِمِیۡنَ ○ وَ مِنَ الشَّیٰطِیۡنِ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَهٗ وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِكَ وَ کُنَّا لَهُمۡ حٰفِظِیۡنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الا نبیاء 78-82/21)

ترجمہ:

”اور اسی نعمت (علم وحکمت) سے ہم نے داؤد کو سرفراز فرمایا۔ یاد کرو وہ موقع جب وہ

دونوں ایک کھیت کے مقدمے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ جس میں رات کے وقت بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم اِن کی عدالت خود دیکھ رہتے تھے۔ اس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا حالانکہ علم اور حکم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔ داؤدؑ کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا' اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔ اور ہم نے اس کو تمھارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صفت سکھا دی تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے' پھر کیا تم شکر گزار ہو؟ اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا جو اُس کے حکم سے اِس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اُس کا تابع بنا دیا تھا' جو اُس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ اور اِن کے نگران ہم ہی تھے''۔

✡✡✡✡✡✡

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اس قدر عظیم بادشاہ تھے کہ اِن کا اقتدار انسانوں کے علاوہ جنوں شیطانوں اور پرندوں اور ہواؤں تک پھیلا ہوا تھا اس کے باجود اپنی اس طاقت وثروت اور عظیم وعجیب طاقتوں سے مزین بادشاہت کے متعلق اُن کا یہ کہنا تھا کہ یہ سب تو ہمارے رب کا فضل ہے۔

اور یہی وہ فرق ہے جو مادیت اور روحانیت میں پایا ہے جو قارون اور حضرت داؤد علیہ السلام وسلیمان علیہ السلام کے نقطہ نظر سے ظاہر ہو رہا ہے۔ قرآن حکیم حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس اظہارِ تشکر کو یوں بیان کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ

فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ○ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰٓی اِذَآ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰی وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ النمل 15-20/27)

ترجمہ:

ہم نے داؤد و سلیمانؑ کو علم عطا کیا اور انھوں نے کہا شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پہ فضیلت عطا کی۔ اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔ اور اُس نے کہا: لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں۔ بیشک یہ اللہ کا (نمایاں) فضل ہے۔ سلیمان کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ اپنے لشکروں کے ساتھ) کوچ کر رہا تھا یہاں تک کہ وہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: چیونٹیو اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اُس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔ حضرت سلیمان نے چیونٹی کی بات

سنی اور ہنس پڑے اور کہا: اے میرے رب مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے۔ اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں شامل کر"۔

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ دو مختلف رویوں کا حوالہ دے کر قرآن مجید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی علم کیا ہے اور جو علم اللہ کی طرف سے انسان کو عطا ہوتا ہے اس کا اظہار عملی زندگی میں کیسے ہو۔ پھر ایک اور فرق جو قرآن نمایاں کر رہا ہے کہ قارون اپنے خزانوں کو اپنی صلاحیت، علم اور مہارت کا حاصل سمجھتا ہے۔ اپنی ذہنی اور جسمانی مشقت کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور وہ اسے خالق کی عطا یا بخشش قرار دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ چونکہ وہ اپنے مال و متاع کا سرچشمہ اپنی ذات ہی کو قرار دیتا ہے اس لیے کسی کا شکر گزار ہونے کا بھی روادار نہیں۔ اس کے برخلاف اللہ کے پیغامبر علم، حکمت، نبوت ، اقتدار اور دولت غرض ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ یہ سب تو انھوں نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔

بلکہ اس معاملے میں وہ اس قدر دیانتدار اور صاف گو ہیں کہ ہر عطا پر منعم حقیقی کا نام لیتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی یہ تصریحات مادی اور حقیقی علم کے فرق کو نمایاں کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علم حاصل کرنا، کائنات پہ غور و فکر کرنا، اور زندگی گزارنے کے لیے سہولیات حاصل کرنا، انسانوں کی آسانی اور بھلائی کے لیے قوانین وضع کرنا احسن انسانی اعمال ہیں۔ فرق صرف اُس طرزِ فکر کا ہے کہ جب انسان کو مادی ذرائع علم حاصل ہو جاتے ہیں تو حاملین وحی کا رویہ کیا ہوتا ہے اور خالق سے انکاری لوگوں کا رویہ کیا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پہ یقین رکھنے والے علم حاصل ہونے کے بعد خالق کا شکر ادا کرتے ہیں جب کہ مادیت پسند علم حاصل ہونے کے بعد خالق کی اس زمین کو خالق کے انسانوں کا چہرہ خون سے رنگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے

ایک اور بات بھی نمایاں ہو کے سامنے آ رہی ہے۔ اصل میں علم چاہے کوئی بھی ہو کسی بھی قسم کا ہو کبھی ضرر رساں نہیں ہوتا بلکہ اُس علم کو استعمال کرنے والے لوگوں ذہنیت اس علم کے اثرات کو زہریلا بنا دیتی ہے۔ یاد کریں کہ انسان نے ایٹم کو توڑ کر توانائی حاصل کرنے کا طریقہ دریافت کیا مگر بعض ظالموں نے اسی ایٹم کو توڑ کر ابن آدم کے لیے بربادی کا نشان بنا دیا ایک محتاط اندازے کے مطابق اس دنیا میں اس وقت اتنے ایٹمی ہتھیار موجود ہیں جو کرہ ارض کو صرف تین منٹوں میں جلا کر راکھ کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ یورینیم کی افزودگی تو محض ایک علم ہے انسان اگر چاہے تو اس سے پیدا ہونی والی توانائی سے بستیوں کی بستیاں روشن کر دے اور اگر وہ چاہے تو انھی بستیوں کو خاک و خون میں نہلا دے۔

تاہم چونکہ جدید سائنسی علوم کی ترویج عام طور پچھلی دو صدیوں میں معرض وجود میں آئی ہے۔ اور یہ دونوں صدیاں حقیقتاً اہل مغرب کی صدیاں ہے اس لیے اِن صدیوں میں علم کے جو مظاہر منظر عام پہ آئے اُن میں خالق سے بے اعتنائی اور انسانیت کی بربادی اور استحصال کا عکس نمایاں طور پہ محسوس کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ علم جس سماجی پس منظر میں فروغ پاتا ہے وہ اس کے اثرات سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوتا ہے۔ اور مغرب کسی بھی قسم کے اخلاقی نظریے یا مذہبی تخیل سے خود کو آزاد قرار دیتا ہے اور وہ صرف طاقت کی زبان میں بات کرتا ہے جو اسے سائنس کے غلط استعمال سے حاصل ہو گئی ہے۔

چنانچہ علم کی اقدار جب اُن ہاتھوں سے گزرے جو خالق کے انکاری ہوں تو ظلم وحشت کے سائے انسانیت پہ لہرانے لگتے ہیں اور یہی آج کی دنیا کا ظاہری منظر ہے۔ امریکہ جو اس مادی دنیا کا سربراہ تصور کیا جاتا ہے طاقت کے اندھے استعمال پہ یقین رکھتا ہے۔ اُس نے عراق اور افغانستان میں لاکھوں بے گناہ لوگوں کو قتل کیا ہے اور محض اپنی سرداری کو قائم رکھنے کے لیے دنیا کے ستر سے زائد ممالک میں اپنے فوجی اڈے قائم کر رکھے ہیں۔ اس ساری بحث سے ایک اور سوال بھی ابھر کے سامنے آیا ہے کہ علم کا غلط استعمال اور ایجادات کا غلط استعمال کس طرح اور کیوں کر وقوع پذیر ہوتا

ہے۔

اس کا جواب بھی قرآن حکیم ہی سے درج کیا جاتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے سارے علوم دراصل کائنات کے وہ اسرار ہیں جن کا پردہ انسان اپنی جستجو اور استقلالِ عزم کے باعث چاک کرتا ہے۔اور جب کائنات کا کوئی راز منکشف ہو کے انسان کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے تو انسان کی آزمائش کا نیا دور شروع ہو جاتا ہے کہ وہ اس انکشاف کو مقاصد کے تعین میں کہاں جگہ دیتا ہے۔کیا وہ اسے انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کرتا ہے جیسا کہ پینسلین کے موجود نے اپنے انکشاف کو انسان کے نام کیا اور اسے انسانیت کی فلاح کے لیے وقف کر دیا۔یا ایٹم کو توڑنے والے سائنس دانوں کی طرح اسے مہیب انسانی تباہی کے لیے آگ کا گولا بنا دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنی نقطہ نظر کے مطابق پینسلین کا موجد سرخرو ہوا اور ایٹم کی توانائی کو انسانی فلاح کی بجائے انسان کی ہلاکت کے لیے مرتب کرنے والے سائنس دان شیطان کے قبیلے سے متعلق نکلے اور انھوں نے شیطان کے نظریہ کی پیروی اختیار کی۔

علم کے بارے میں چونکہ یہ بات بطور خاص اہمیت کی حامل ہے کہ علم فی نفسہ ضرر یا منفعت کا پہلو رکھتا ہے یا یہ انسان کا استعمال ہے جو علم میں خیر یا شر کی روح پھونک دیتا ہے۔قرآن مجید میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس سے علم کے اس پہلو کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ

كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُولَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 101-103/2)

ترجمہ:

''اور جب اُن کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اُس کتاب کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے جو اِن کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو اِن اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔اور لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو وہ شیطان تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔وہ پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پہ نازل کی گئی تھی۔حالانکہ وہ فرشتے جب کسی کو اس کی تعلیم دیتے تو پہلے متنبہ کر دیتے کہ دیکھو یہ علم ایک آزمائش ہے کہیں اس کے ذریعے تم کفر میں مبتلا نہ ہو جانا، پھر بھی یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھتے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں، ظاہر ہے کہ اذنِ الٰہی کے بغیر وہ اس علم کے ذریعے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے

باوجود وہ اُن سے ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود اُن کے لیے بھی فائدہ مند نہ تھی۔ بلکہ نقصان دہ تھی اور وہ اس بات سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ اُس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کتنی بری متاع تھی وہ جس کے بدلے میں انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ اگر وہ ایمان اور تقوی اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں سے انھیں اس کا جو بدلہ ملتا وہ اِن کے لیے کہیں زیادہ بہتر تھا، کاش وہ جانتے''۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

اِن آیات کے آغاز میں تو اُن امور کی طرف اشارہ کیا گیا جن کے باعث قوم بنی اسرائیل کو سیادت سے منصب سے معزول کیا گیا مگر چونکہ یہ ہمارا موضوع نہیں اس لیے اس سے ہٹ کہ ہم اپنی توجہ اُن امور پہ مبذول کریں گے جو موضوع سے متعلقہ ہیں۔ اِن آیات میں ایک ایسے علم کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ کے دو فرشتوں کے ذریعے بابل کے لوگوں پہ اتارا گیا۔ فرشتوں نے لوگوں کو بتایا کہ ہمارے پاس ایک علم ہے جس سے تم چاہو تو فائدہ بھی اٹھا سکتے ہو مگر دوسری طرف یہی علم ایک آزمائش بھی ہے کہ اگر تم اس کا غلط استعمال کرو گے اسے انسانی فلاح کے خلاف استعمال کرو گے اور اس سے میاں بیوی میں جدائی ڈالو گے تو تم کفر کا شکار ہو جاؤ گے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میاں بیوی میں جدائی کا جو اشارہ اِن آیات میں کیا گیا ہے وہ کوئی حقیر امر ہے۔ یاد رہے کہ خاندان کی بنیاد میاں اور بیوی ہی تو ہیں اگر اُن کے درمیان جدائی ڈال دی جائے تو خاندان ٹوٹ جاتا ہے اور اگر یہ بنیادی ادارہ ٹوٹ جائے تو اس سے پورا سماج متاثر ہوتا ہے اور اگر اس ادارے کی ٹوٹنے کی شرح بڑھ جائے تو پورا معاشرہ انارکی کا شکار ہو جاتا ہے جیسا کہ آج کا مغرب اس امر کا شاہد ہے۔ اب ہم اس بات پہ غور کرتے کہ علم کی وہ کون سی قسم تھی جسے لے کر ہاروت و ماروت کو اتارا گیا تھا۔ غالب مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ وہ جادو کا علم تھا مگر بیسیویں صدی کے ممتاز مفسر امام امین احسن اصلاحیؒ کا نقطہ نظر معاصرین سے مختلف ہے آیئے اس پہ ایک نظر ڈالتے ہیں۔ تدبر قرآن میں وہ اِن آیات کی تشریح میں لکھتے ہیں

کہ!

"اگر یہ جادو کا علم ہوتا تو اس کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی قرآن نے اس کے لیے "انزل" کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پہ اتارا گیا۔ اس لفظ میں افادیت اور عنایت کی جو شان ہے اس کے پیش نظر جادو جیسی ناپاک اور سراسر باطل چیز کے لیے اس کا استعمال ذوق پر گراں محسوس ہوتا ہے۔ یہ علم فرشتوں پہ اتارا گیا اور وہ اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، فرشتوں کا دامن شک وفکر کی ہر آلائش سے پاک ہوتا ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و عدل کے قیام اور خیر وفلاح کی دعوت و تعلیم کا ذریعہ بنتے ہیں لہٰذا یہ بات عقل سے بعید تر ہے کہ جادو کا علم اُن پہ اترے اور وہ اس کی اشاعت کریں۔ شیاطین کا علم خود قرآن کے اپنے الفاظ کے مطابق کفر تھا لیکن فرشتوں کے ذریعے اتارے گئے اس علم کے لیے کفر کا نہیں بلکہ فتنہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ فتنہ کے معنی امتحان یا آزمائش کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس لفظ سے مراد بالعموم وہ اشیاء ہیں جو اصلاً تو انسان کی فلاح و بہبود کے لیے پیدا کی گئی ہیں لیکن یہ اِن کا سوئے استعمال ہے جس کے باعث وہ انسانوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہیں"۔

✡✡✡✡✡✡

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی اس بحث سے یہ امر ظاہر ہوا کہ بعض علوم ایسے ہوتے ہیں جن کے حاصل کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے تاہم اِن علوم کے اندر اُن کے استعمال کے حوالے سے نزاکت کا ایک احساس ضرور پایا جاتا ہے۔ اور اُن کے استعمال میں ذراسی بے احتیاطی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ اس طرح کے علوم اگر کسی سنکی کے ہاتھ لگ جائیں تو اُس کا نتیجہ سوائے انسانیت

کی بربادی کے اور کیا نکل سکتا ہے۔قرآن حکیم کی انھیں آیات کو اگر ہم جدید علوم پہ منطبق کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کو اس کے نفس نے دھوکا دیا ہے۔اور وہ علم، دولت، اقتدار، قوت اور حیات کے پس منظر میں موجود آزمائش کو نہیں سمجھ سکا۔انسان کے سامنے جب کائنات کا کوئی راز منکشف ہوا یعنی اس کے ہاتھ علم کا کوئی نیا پہلو لگا تو وہ اس نے آزمائش کے اُس پہلو کو نظر انداز کیا جو اس انکشاف کا اصل مقصد تھا۔چنانچہ اُس نے ایٹم کو پھاڑا تو ایٹم بم بنایا۔اگرچہ اس وہ بے انتہا توانائی حاصل کر سکتا تھا جس سے بہت سے مثبت اثرات انسانی زندگی پہ مرتب ہو سکتے تھے مگر اُس نے اسے انسانیت کے قتل کے لیے استعمال کیا۔چنانچہ کئی صدیوں سے علم کا منفی استعمال کیا جا رہا ہے جو خالق کی منشا کے خلاف ہے۔

اس سے ایک تاثر ابھر کے سامنے آیا کہ قرآن جدید سائنسی علوم کے خلاف ہے۔اگرچہ حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں۔بات اگر کوئی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت دو ہی تہذیبیں ہیں ایک اسلامی تہذیب جس کے مظاہر اگرچہ قدرے معدوم ہیں مگر اُس کی اساس محکم ہے۔دوسری طرف خالق سے بے اعتنائی یا خالق سے مطلق انکار پہ استوار وہ تہذیب ہے جس کی ظاہری چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے مگر اصلاً اُس کی بنیاد کھوکھلی ہے۔اس لیے کہ مادیت کی اس تہذیب کی بنیاد حقیقت پہ نہیں بلکہ تخیل پہ رکھی ہے۔اور وہ تخیل ہے خالق کے وجود سے عاری ایک ایسے معاشرے کا قیام جس کے تمام اصول انسانیت کو خوشی اور لذت فراہم کرنے کے لیے مختص ہوں۔

چنانچہ یہ تاثر کہ اسلام سائنس کی ایجادات کے خلاف ہے اسلام کو محدود کرنے لیے وضع کیا گیا ایک نظریہ ہے جس کی بنیاد میں اسلام کو رجعت پسند مذہب ثابت کرنے کا تصور مغربی مستشرکین نے فراہم کیا ہے۔مغربی صاحب دانش نے گذشتہ دو صدیوں میں اگرچہ انسانیت کو اخلاقیت اور سماجیات اور معاشرت کے کوئی عمدہ تخیل فراہم نہیں کیے۔تاہم سائنس یعنی مادیت میں اُس کے کام کو خاطر خواہ قرار دے جا سکتا ہے جس سے انسانی زندگی میں بہت سہولت اور آسانی در آئی ہے۔تاہم چونکہ اُن کے علم کا تصور عقلیت پسندوں نے وضع کیا ہے جس کو یونانی فلسفہ سے بنیادیں فراہم کی گئیں

اس لیے اُن کے ہاں شکر کا کوئی مقام وضع نہ ہوسکا جو علم کی بنیادی اساس ہے۔ چنانچہ اسلام اُس سارے علم کو مجاز قرار دیتا ہے جس کے پیچھے شکر کا جذبہ نہ ہو، جس کے پیچھے خالق کا انکار ہو، جس کے پیچھے کوئی اخلاقی بنیاد نہ ہو، جس کے پیچھے انسانیت کی فلاح کا تصور مفقود ہو۔ اگرچہ اسلام ہر قسم کے علم کا اثبات کرتا ہے اور یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ہر قسم کا علم اُسی عقل کی عطا ہے جو خالق ہی کی فراہم کردہ ہے۔ مگر وہ اس علم کو علم نہیں جہل قرار دیتا ہے جس کی بنیاد پہ انسان خالق کے گریبان پہ ہاتھ ڈالنے لگے یعنی تکبر کی راہ کو چل نکلے۔

✡ ✡ ✡

اسلام کا تصورِ فلاح

اسلام کا تصورِ فلاح دیگر اقوام کے نظریات و افعال کی طرح الجھا ہوا اور پیچیدہ نہیں ہے بلکہ اپنی نوعیت میں اس قدر سادہ اور سہل ہے کہ انسان کو اسے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ تاہم اس سے قبل کہ ہم اسلام کے تصورِ فلاح پہ کچھ کہیں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ کائنات میں انسان کے مقام کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے تاکہ انسان کو یہ ادراک حاصل ہو جائے کہ نہ تو وہ اس قدر ادنیٰ مخلوق ہے کہ جانوروں، درختوں پہاڑوں، آگ، بادل، بجلی، چاند، سورج، اور ستاروں کے آگے سر جھکاتا پھرے اور نہ ہی اس وہ قدر ارفع ہے کہ عقل کے سہارے اُس کے ہاتھ خالق کے گریبان تک جا پہنچیں اور وہ تکبر کی راہ پہ چل پڑے اور اللہ کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلے۔ سرسری سی نگاہ ڈالنے سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ زمین کے سینے پر اِن دونوں قسموں کے بے پناہ لوگ موجود ہیں جو ایک طرف تو شرف کے ہر احساس سے تہی پتھر اور مٹی کے بتوں کے آگے سر جھکا رہے ہیں اور انھیں اس بات کی ذرا بھی خبر نہیں کہ انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نیابت کے لیے اتارا ہے اور وہ کائنات کی سب سے ارفع مخلوق ہے۔ ہمارے قریب ہی ہندوستان میں ایک ارب سے زائد لوگ بت پرستی

میں ملوث ہیں اور عقل کے اندھوں کی طرح بغیر سوچ سمجھے اپنے آباء کے دین پہ قائم چلے آئے ہیں۔ ہماری (پاکستان) سرحد کی دوسری طرف یعنی مغرب میں روس اور چین میں تقریباً دو ارب لوگ اللہ کے وجود سے انکاری ہیں اور بغیر کسی دلیل کے اس امر کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اُس سے پرے مغرب ہے جو کہنے کو تو خود کو نصاریٰ کہتے ہیں مگر حقیقت میں اُن کے نزدیک نہ کوئی خالق ہے اور نہ ہی خالق کے مخلوق پر کچھ حقوق ہیں۔ وہ مادیت کی منزلوں کے مسافر ہیں اور اپنے اہداف کے حصول میں اس قدر الجھ کے رہ گئے ہیں کہ اُن کے پاس اس بات پہ فکر کرنے کے لیے وقت ہی نہیں کہ آخر خالق نے انھیں اس زمین پر کیوں اتارا ہے۔ لوگوں کا وہ گروہ جو بتوں کا پجاری ہے اخلاقی اور فکری طور پہ اس قدر پست ہے کہ اُس کے مزید تذکرے کی ہم ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ وہ ارذل لوگ ہیں اگرچہ انھیں دعوت کی ضرورت ہے مگر وہ اپنے حالات اور اعمال پہ مطمئن ہیں اگرچہ مسرور نہیں۔

دوسری طرف متکبرین ہیں جو اللہ کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں اور کسی خالق کے وجود سے عاری ہیں۔ یہ دنیا جس میں ہم بستے ہیں اس میں کثیر تعداد اُن لوگوں کی ہے جو تکبر کے جرم میں مبتلا ہیں۔ یہود نصاریٰ اور ملحدین میں اگرچہ کچھ فکری تفاوت موجود ہے مگر عملی طور پر وہ ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی متکبرین کے قبیلہ سے، چنانچہ قرآن حکیم میں اِن متکبرین کو اُن کی اصل اوقات یاد دلانے کے لیے جا بجا بہت سی آیات اتاری گئی ہیں جن سے یہاں استفادہ مقصود ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاء دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ الطارق 5-7/86)

ترجمہ:

”انسان اپنی حقیقت کو تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان کھینچ کر آتا ہے“۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ طارق میں ارشاد ہوا کہ :

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ..

القرآن الحکیم (سورۃ الطارق 77-78/36)

ترجمہ؛

”کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اُس کو ایک قطرہ آب سے بنایا ہے اور اب وہ کھلم کھلا ہمارا حریف بنتا ہے، ہمارے لیے مثالیں دیتا ہے اور اپنی اوقات کو بھول گیا ہے“۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ سجدہ میں فرمایا گیا کہ :

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ (7) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ (8) ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ..

القرآن الحکیم (سورۃ السجدہ 7-9/32)

ترجمہ:

”انسان کی ابتدا مٹی سے کی، پھر مٹی کے نچوڑ سے جو ایک حقیر پانی ہے اس کی نسل چلائی پھر اس کی بناوٹ درست کی اور اُس میں اپنی روح پھونکی“۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ حج میں انسان کے تخلیقی مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا جاتا ہے کہ:

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ الحج 5/22)

ترجمہ؛

’’ہم نے تم کو مٹی سے، پھر قطرہ آب سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر پوری اور ادھوری بنی ہوئی بوٹی سے پیدا کیا تا کہ تم کو اپنی قدرت دکھائیں ۔ اور ہم جس نطفہ کو چاہتے ہیں ایک مدت مقررہ تک رحم مادر میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں، پھر تم کو بڑھا کر جوانی کو پہنچاتے ہیں ۔ تم میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد پھر ناسمجھ ہو جائے‘‘ ۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ الانفطار میں فرمایا کہ :

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ○ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ○ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانفطار 6-8/82)

ترجمہ:

”اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے مغرور کر دیا ہے؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا، تیرے اعضاء درست کیے، تیرے قویٰ میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترتیب دی“۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ النحل میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ النحل 78/16)

ترجمہ:

”اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، جب تم نکلے تو تم اس حال میں تھے کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس نے تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں دل دیئے شاید کہ تم شکر کرو“۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ مریم میں فرمایا کہ :

أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ O أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ O نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ O عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا

تَعْلَمُونَ ٥ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَى فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ٥ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ٥ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ٥ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ٥ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ٥ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ٥ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ٥ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ٥ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ٥ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ٥ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ٥ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ٥ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ٥

القرآن الحکیم (سورۃ مریم 56/74-58)

ترجمہ:

"کیا تم نے اُس نطفہ پر غور کیا ہے جسے تم عورتوں کے رحم میں ٹپکاتے ہو؟ اس سے بچہ تم پیدا کرتے ہو یا ہم اس کے پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے ہی تمھارے درمیان موت کا اندازہ مقرر کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری جسمانی شکلیں بدل دیں اور ایک اور صورت میں تم کو بنا دیں جس کو تم نہیں جانتے، اور تم پہلی پیدائش کو تو جانتے ہی ہو پھر اس سے سبق حاصل کیوں نہیں کرتے؟ پھر کیا تم نے دیکھا کہ یہ کھیتی باڑی جو تم کرتے ہو اِس کو تم اگاتے ہو یا اِس کو اگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس بنا دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم نقصان میں رہے بلکہ محروم رہ گئے۔ پھر کیا تم نے اس پانی کو دیکھا ہے، جسے تم پیتے ہو؟ اس کو تم نے بادلوں سے اتارا ہے یا اس کو اتارنے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کھاری بنا دیں۔ پس کیوں تم شکر ادا نہیں کرتے؟ پھر تم نے اس آگ کو دیکھا ہے جسے تم سلگاتے ہو؟ جن درختوں

سے یہ لکڑی لائی جاتی ہے اُن کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم نے؟ ہم نے اس کو ایک یاد دلانے والی چیز اور مسافروں کے لیے سامانِ زیست بنایا ہے۔ پس اے انسان اے اپنے خدائے بزرگ و برتر کی تسبیح کیا کرو"۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا کہ :

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلاَّ إِيَّاهُ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الإِنْسَانُ كَفُوراً ٥ أَفَأَمِنتُمْ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِباً ثُمَّ لاَ تَجِدُواْ لَكُمْ وَكِيلاً ٥ أَمْ أَمِنتُمْ أَن يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفا مِّنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُم بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لاَ تَجِدُواْ لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعاً ٥

القرآن الحکیم (سورة سورة بنی اسرائیل 69-67/17)

ترجمہ:

"جب کبھی سمندروں میں تم پر طوفان کی مصیبت آتی ہے تو تم اپنے سب معبودانِ باطل کو بھول جاتے ہو اور اس وقت تمھیں صرف اللہ رب العزت کی یاد آتی ہے۔ پھر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو تم پھر پرانی روش پر لوٹ آتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ خدا تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے اور تم کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ خدا تم کو دوبارہ اس سمندر میں لے جائے اور تم پر ہوا کا ایسا طوفان

بھیج دے تو تمہیں نافرمانی کے بدلے میں غرقاب کر دے اور پھر تم ہمارا پیچھا کرنے والا کسی کو حمایتی نہ پاؤ گے"۔

✡✡✡✡✡✡

یہ محض کچھ آیات تھیں جو اس ضمن میں پیش کی گئیں جن میں انسان کو تکبر کے رویے سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔خدا کے انکار سے روکا ہے، خدا کی خدائی میں اکڑ اکڑ کر چلنے سے ٹوکا ہے، اِن آیات میں انسان کے غرور و تکبر کو محض جہالت اور بلا جواز قرار دیا گیا ہے اور اُس کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی گئی ہے کہ پانی کے محض ایک اچھلتے ہوئے گندے قطرے سے تمھارا آغاز کیا گیا ہے۔اُس حقیر پانی کے قطرے کی رحم مادر میں پرورش کی جاتی ہے اور وہ گوشت کے لوتھڑے میں بدل جاتا ہے۔خدا چاہے تو اس لوتھڑے میں جان ڈالے چاہے تو یونہی وہ غیر مکمل حالت میں خارج ہو جائے۔خدا اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا ہے، اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور اسے اُن آلات اور اُن قوتوں سے مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو یاد کراتا ہے کہ جب تم دنیا میں آئے تو کس قدر بے بس تھے، تم اپنی کوئی حاجت پوری کرنے پر قادر نہ تھے۔تو وہ خدا ہی تھا جس نے اپنی قدرت سے ایسا اہتمام کیا کہ محبت سے تیری پرورش کی جائے، تو بڑھتا رہا، جوان ہوا طاقتور اور قادر ہوا، اللہ نے تجھے نعمتوں سے نوازا مگر تو نے اُس کا شکر ادا نہ کیا۔تو دولت کے پیچھے بھاگا پھر اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کا غلام رہا۔تو نے ایک بار بھی نہ سوچا کہ تجھے کس لیے پیدا کیا گیا ہے۔تو نے شرک کیا۔حالانکہ تیرا رب اگر چاہتا تو تجھ سے تیرے گناہوں کا بدلہ ایک لمحے میں لے لیتا وہ تجھے بد ترین سزا دیتا مگر اُس کا حلم اور رحم ہی ہے جو تجھ کو تیرے گناہوں سمیت اپنی زمین پر چلتا رہنے دیا۔

اے غافل انسان سُن!

اگر اللہ چاہتا تو ہوا کو حکم دیتا وہ رُک جائے تب تو سانس کیسے لیتا، اگر اللہ چاہتا تجھے پانی نہ ملے تو وہ سمندروں دریاؤں اور بادلوں کو حکم دیتا کہ غائب ہو جاؤ اور اگلے روز جب تم سو کر اٹھتے تو تم جانتے کہ کہیں بھی پانی نہیں تب تم کیا کرتے؟ یہ روشنی، یہ ہوا، یہ انواع اقسام کے پھل، یہ غلہ، یہ رنگ رنگ کے سامانِ زیست آخر تم کو کس نے عطا کیے اللہ نے اور تم اللہ کے خلاف باتیں کرتے ہو اللہ کی حکومت اور اقتدار کو افسانہ قرار دیتے ہو۔ افسوس ہے تم پر کہ تم کو عقل عطا کی گئی اس کے باوجود تم اپنے خالق کی حکمت اور دانائی تک نہ پہنچ سکے اور اُس کی نعمتوں کا شکر کرنے کی بجائے اُسی کی زمین میں فساد پھیلانے لگے۔ تو نے لوگوں سے برا سلوک کیا، لوگوں کا حق مارا، لوگوں کو اذیت دی، دھوکے دیئے، کفر کیا، شکر سے دور رہے، حتیٰ کہ تیری مہلت عمر گزرتی رہی، پھر تیرے اعضاء میں کمزوری آنے لگی، پھر تو بوڑھا ہو گیا، پھر تو بستر سے لگ گیا مگر تو نے کبھی توبہ نہ کی اپنے خالق کے در پہ اپنے گناہوں اور غلطیوں کا اعتراف نہ کیا حتیٰ کہ قبر کی مٹی نے تجھے اپنے اندر سمو لیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تکبر سے روکا اور اُس کو اُس کے اصل مقام سے آگاہ کیا۔ اب اسی تصویر کا دوسرا رخ دکھایا جاتا ہے جس میں انسان کو بتایا گیا کہ یہ درخت یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ بجلی، یہ بادل، یہ آگ اس لیے پیدا نہیں کی کہ تو اِن اشیا کے سامنے جھک جائے بلکہ یہ سب کچھ تو تمھاری خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، یہ سب تو تیرے غلام ہیں اور تو ہے کہ عقل سلیم کے باوجود اپنے ہی غلاموں کے سامنے سر جھکانے لگا حالانکہ اللہ نے تو تجھے بلند رتبوں سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انسان کی جس تکریم اور رتبے کو بیان کیا ہے اس ضمن میں چند آیات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے تا کہ انسان شکر کی راہوں کی طرف مراجعت کر سکے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا O

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل 17/70)

ترجمہ:

''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اُن کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور اُن کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی اُن چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں اِن کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ نحل میں فرمایا گیا کہ :

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (6) وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ (7) وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (8) وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ وَلَوْ شَاء لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ (9) هُوَ الَّذِي أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَّكُم مِّنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ (10) يُنبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (11) وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي

ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (12) وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الأَرْضِ مُخْتَلِفاً أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ (13) وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُواْ مِنْهُ لَحْماً طَرِيّاً وَتَسْتَخْرِجُواْ مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُواْ مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (14) وَأَلْقَى فِي الأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَاراً وَسُبُلاً لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (15) وَعَلامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (16) أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لاَّ يَخْلُقُ أَفَلا تَذَكَّرُونَ (17) وَإِن تَعُدُّواْ نِعْمَةَ اللّهِ لاَ تُحْصُوهَا إِنَّ اللّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (18) وَاللّهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ

القرآن الحکیم (سورۃ النحل 5-19/16)

ترجمہ:

''اور ہم نے جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمھارے لیے سردی سے حفاظت کا سامان ہے اور دیگر فائدے ہیں جن میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ اِن میں تمھارے لیے ایک شان و جمال ہے جب کہ تم صبح اُن کو لے کر جاتے ہو اور شام کو واپس لاتے ہو۔ وہ تمھارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر شدید دقت کے نہیں پہنچ سکتے۔ تمھارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ گھوڑے اور خچر اور گدھے تمھاری سواری کے لیے ہیں اور سامانِ زیست ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزوں کو پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تمھارے پینے کے لیے ہے اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کے لیے چارہ حاصل کرتے ہو۔ اسی پانی سے خدا تمھارے لیے

کھیتی اور انگور اور طرح طرح کے پھل اُگاتا ہے۔اِن چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔اسی نے تمھارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کیے ہیں، یہ سب اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں اِن میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور بہت سی وہ مختلف الانوع چیزیں ہیں جو اللہ نے زمین میں تمھارے لیے پیدا کی ہیں، اِن میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی) نکال کر کھاؤ،اور زینت کا سامان (موتی وغیرہ) نکال کے پہنو۔ اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئیں سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔چنانچہ سمندر کو اس لیے بھی مسخر کیا گیا کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجالاؤ۔اس نے زمین میں پہاڑ لگا دیئے کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ تم منزل مقصود کی راہ پاؤ۔اور بہت سی علامات بنائیں منجملہ اُن کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں اور کیا پیدا کرنے والا اُس کے برابر ہوسکتا ہے جو پیدا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو اُن کو بے حساب پاؤ گے۔اللہ واقعی بڑی مغفرت والا اور بہت رحم کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ تمھارے پوشیدہ اور کھلے ہوئے تمام رازوں سے آگاہ ہے“۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

اوپر جو آیات تحریر کی گئی ہیں اُن میں انسانی سوچ کے دو پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور اُس کی رہنمائی فرمائی گئی ہے۔اول یہ کہ انسان سرکائنات اپنے مقام کو سمجھے اور جانے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں دخل اندازی نہیں کرسکتا۔وہ انتہائی حقیر ہے اُس کی خدائی کے مقابل وہ بہت حقیر

ہے اس لیے اُس کو زیبا نہیں کہ وہ اپنا ہاتھ خالق کے گریبان تک لے جائے اور تکبر کی راہ کو چل دے، پھر فرمایا کہ انسان اس قدر ہیچ بھی نہیں ہے کہ وہ درختوں، پتھروں، بادل، بجلی اور آگ اور لکڑی اور پتھر کے بتوں کو اپنا معبود بنا لے اور اُن سے حاجت روائی کے لیے اُن کو پکارنا شروع کر دے۔ انسان کو بتایا گیا کہ اُس کا رتبہ اس سے بہت بلند ہے اور وہ زمین پر اللہ کا نائب ہے اُس کا خلیفہ ہے تمام کائنات کو اُس کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے تا کہ وہ اللہ کے احکامات کی پیروی میں کوئی دقت محسوس نہ کرے۔ چنانچہ اُس کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کا نائب ہے اور اُس کو اللہ کی عظمت اور بزرگی کے گیت گانے ہیں تا کہ وہ خود کو حق نیابت کا اہل ثابت کر سکے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُواْ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ (30) وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاء كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاء هَؤُلاء إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (31) قَالُواْ سُبْحَانَكَ لاَ عِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (32) قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ (33) وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلاَئِكَةِ اسْجُدُواْ لآدَمَ فَسَجَدُواْ إِلاَّ إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ

الْكَافِرِينَ (34) وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَـذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْظَّالِمِينَ (35) فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ O

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/35-30)

ترجمہ؛

''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انھوں نے کہا! اے ہمارے رب کیا تو اُس کو زمین میں اپنا نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا، اور خونریزیاں کرے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اُس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا، اگر تم سچے ہو تو مجھے اِن چیزوں کے نام بتاؤ؟ انھوں نے کہا' پاک ہے تیری ذات ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھایا ہے، اور تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا! اے آدم اِن فرشتوں کو اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ پس جب آدم نے فرشتوں کو اُن چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا' میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں جو کچھ تم چھپاتے اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو مجھے اُن سب کا علم ہے۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اُن سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدم سے کہا

کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو با فراغت کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکنا کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ مگر شیطان نے اُن کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے اُس سے اُن کو نکلوا دیا"۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ حجر میں فرمایا کہ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (28) فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُواْ لَهُ سَاجِدِينَ (29) فَسَجَدَ الْمَلآئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ (30) إِلاَّ إِبْلِيسَ أَبَى أَن يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ (31) قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلاَّ تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ (32) قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (33) قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (34) وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ O

القرآن الحکیم (سورۃ الحجر 12/11)

ترجمہ؛

"اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں کالے، سڑے ہوئے، سوکھے ہوئے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اُس کو سجدہ کرنا۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اُس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا! ابلیس تجھے کیا ہو

گیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا تو اُس نے جواب دیا میں ایسا نہیں ہوں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے کالے سڑے ہوئے، سوکھے ہوئے گارے سے بنایا ہے، خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا۔ راندۂ درگاہ ہو، یوم جزا تک تم پہ لعنت ہے"۔

✡✡✡✡✡✡

اس مضمون کو قرآن حکیم میں مختلف جگہ اور مختلف طریقوں سے متعدد بار بیان کیا گیا ہے اِن تمام آیت پر مجموعی نگاہ دوڑانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالٰی نے انسان کی فلاح کے لیے کون سا راستہ مقرر فرمایا ہے۔ اللہ تعالٰی نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا اور اُس کو فرشتوں سے بڑھ کے علم دیا اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی۔ فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس نائب کو سجدہ کرو فرشتوں نے آدم کو سجدہ کرلیا اس طرح ملوکیت انسانیت کے سامنے جھک گئی انسانیت کی فضیلت مسلّم ہوگئی۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور وہ جنوں میں سے تھا اس طرح شیطانی قوتوں نے انسان کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا اور شیطانی قوتیں انسان کے سامنے سینہ تانے کھڑی ہوگئیں۔ انسان حقیقت میں تو مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا مگر خدا نے اُس میں جو اپنی روح پھونکی تھی اور اُس کو علم میں جو فضیلت بخشی تھی اس بنا پر وہ خلافت خداوندی کا اہل قرار پایا۔ جب کہ شیطان نے اُس کی عظمت کو تسلیم نہ کیا اور اس جرم میں اُس پر لعنت بھیج دی گئی۔ مگر اُس نے قیامت تک مہلت مانگ لی کہ وہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ شیطان نے انسان کو بہکایا، جنت سے نکلوایا۔ اُسی روز سے انسان اور شیطان کے مابین رزم گاہ سج گئی۔ اللہ رب العزت نے انسان سے کہہ دیا جس نے میرے احکامات مانے، میرے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کی میں اُسے دوبارہ جنت میں داخل کردوں گا یہی اسلامی تصورِ فلاح ہے یہی الہامی تصورِ فلاح ہے اور جو شیطان کے دھوکے میں آ گیا اور اُس کی

پیروی کرنے لگا تو اُس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور وہ نا کام ہے۔

چنانچہ کتاب مبین میں ارشاد ہوا کہ :

فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (38) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

القرآن الحکیم (سورة البقرہ 38-39/2)

ترجمہ:

"تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، ایسے لوگوں کے لیے کسی سزا کا خوف اور کسی نامرادی کا رنج نہیں ہے اور جنھوں نے نافرمانی کی اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں اُن کو ہمیشہ رہنا ہے"۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

سوہ الاحقاف میں ارشاد ہوتا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۔

القرآن الحکیم (سورة الاحقاف 16/46)

ترجمہ:

"یہ وہ ہیں جن کی خطاؤں کو معاف کر دیا جائے گا اُن کے عمل قبول کر لیے جائیں گے اور انھیں جنتوں میں داخل کر دیا جائے گا"۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

سورہ المائدہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلاَةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنتُم بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللّهَ قَرْضاً حَسَناً لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ۔

القرآن الحکیم(سورۃ المائدہ 12/5)

ترجمہ:

''البتہ اگر تم نماز قائم کرو، زکواۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور اُن کی مدد کرو اور اللہ کا قرض اچھی طرح ادا کرو تو میں تمھارے گناہوں کو تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسی جنت میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی''۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ نساء میں فرمایا گیا کہ :

إِن تَجْتَنِبُواْ كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلاً كَرِيماً۔

القرآن الحکیم(سورۃ النساء 31/5)

ترجمہ:

''تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے اگر تم اُن سے باز رہے اور بری باتوں سے بچتے رہے تو ہم تمھاری خطاؤں کو معاف کر دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے''۔

✡✡✡✡✡✡

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ :

فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (39) أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَاللّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 39-40/5)

ترجمہ؛

''تو جس نے خود پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کرلی اور خود کو سدھار لیا تو بے شک اللہ اُس کی طرف متوجہ ہوگا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے کیا تجھے معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کے پاس ہے اور وہ جس کو چاہے معاف کردے جس کو چاہے سزا دے اس لیے کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ مریم میں فرمایا گیا کہ :

إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئاً ○

القرآن الحکیم (سورۃ مریم 60/19)

ترجمہ؛

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور

اُن پر ظلم نہ کیا جائے گا"۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ فرقان میں ارشاد ہوا کہ :

إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِيماًO

القرآن الحکیم (سورۃ الفرقان 70/25)

ترجمہ:

"مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ نساء میں ہی مزید ارشاد ہوا کہ :

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوَءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُوْلَئِكَ يَتُوبُ اللّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّهُ عَلِيماً حَكِيماً (17) وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الآنَ وَلاَ الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ۔

القرآن الحکیم (سورۃ النساء 17-18/4)

ترجمہ:

"اللہ اُن کی توبہ ضرور قبول کرتا ہے جو نادانی سے گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کرتے

ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں اللہ جن کو معاف کر دے گا۔اللہ سب جانتا ہے اور وہ بہت حکمت والا ہے،مگر اُن کی توبہ قبول نہیں کی جاتی جو برے کام کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا اب میں نے توبہ کی یہ تو اُن کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں گے''۔

✡✡✡✡✡✡

سورہ ہود میں فرمایا کہ :

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ (106) خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ إِلاَّ مَا شَاء رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (107) وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ إِلاَّ مَا شَاء رَبُّكَ عَطَاء غَيْرَ مَجْذُوذٍ۔

القرآن الحکیم (سورۃ ھود 106-108/11)

ترجمہ:

''سارے بد بخت دوزخ کی خوارک بنیں گے اور انھیں اس میں گدھوں کی طرح رینگنا ہے اور چلانا ہے جب تک کہ آسمان اور زمین رہیں گے وہ اسی دوزخ میں رہیں گے مگر تیرا رب جو چاہے کر سکتا ہے اور جو خوش قسمت ہوں گے ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم رہیں مگر جو تیرا رب چاہے اللہ کی بخشش لامحدود ہے

✡✡✡✡✡✡

سورہ بنیہ میں فرمایا کہ :

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَہلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ

فِی نَارِ جَہَنَّمَ خَالِدِینَ فِیہَا أُولَئِكَ ہُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (6)
إِنَّ الَّذِینَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ ہُمْ خَیْرُ
الْبَرِيَّةِ (7) جَزَاؤُہُمْ عِندَ رَبِّہِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِی مِن
تَحْتِہَا الْأَنْہَارُ خَالِدِینَ فِیہَا أَبَداً رَّضِیَ اللَّہُ عَنْہُمْ وَرَضُوا
عَنْہُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہُ (8)

القرآن الحکیم (سورۃ بینہ 6-8/89)

ترجمہ:

''بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنھوں نے کفر کیا وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلتے رہیں گے اور یہ بدترین لوگ ہیں۔ بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ بہترین لوگ ہیں اور اُن کی جزا اُن کے رب کے نزدیک بسنے کے وہ باغ ہیں جن میں نہریں بہتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اُن کا رب اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے''۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

سورہ تغابن میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَيُدْخِلْہُ جَنَّاتٍ تَجْرِی مِن تَحْتِہَا الْأَنْہَارُ خَالِدِینَ فِیہَا
أَبَداً ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیمُ (9) وَالَّذِینَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا
بِآیَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِینَ فِیہَا وَبِئْسَ
الْمَصِیرُ O

القرآن الحکیم (سورۃ التغابن 9-10/64)

ترجمہ:

''اور اُس کو اُن باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلا دیا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی تصورِ فلاح سیدھا اور سہل ہے۔ انسان کو بتا دیا گیا کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے جس طرح کہ اللہ کی لاکھوں کروڑوں دیگر مخلوقات ہیں۔ انسان کو دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز حیثیت سے نوازا گیا ہے۔ اُس کو علم و عقل سے نوازا گیا اور اُسے اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے تو اللہ کی پیروی کرے اور اپنی دنیا اور آخرت دونوں سنوار لے چاہے تو اپنے نفس کی پیروی کرے اور شیطان کا مطیع و فرمانبردار بن کر اپنے نفس کا قیدی بن جائے۔ انسان نے اپنے اس اختیار کا اکثر و بیشتر غلط استعمال کیا اور نفس کی آواز پہ ہی کان لگائے اس لیے شیطان انسان کی راہ میں گھات لگائے بیٹھا ہے اور وہ اسے فوری اور سامنے کے منافع کا لالچ دے کر ورغلاتا ہے اور انسان دھوکے میں آ جاتا ہے۔ یاد رہے اکثر و بیشتر مذاہب میں موت کے بعد حیات کا تصور موجود ہے جزا اور سزا کا تصور بھی موجود ہے، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں تک میں بعد موت از حیات کا تصور موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اِن مذاہب کے پیروکار نہ تو اپنے ادیان کے بارے میں سنجیدہ ہیں اور نہ ہی انھیں اس بات کی کوئی خاص پرواہ ہے کہ موت کے بعد اُن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اسلام نے آخرت کے تصور کو نہایت واضح اور بین دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور انسان کے سامنے اس امر کو کھول دیا ہے کہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہی ہے۔ اس دنیا میں جیسے کیسے وقت گزرے مگر اللہ کی اطاعت کے ساتھ گزرے تو انسان کامیاب ہو گیا۔ دوسری صورت میں یہ زندگی چاہے اُس کے لیے کس قدر آسان ہو، اُس کے پاس دولت کے کتنے ہی انبار ہوں چاہے اُس کی

جائیدادوں کو گنا نہ جا سکے اللہ کو اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں اللہ کے نزدیک اگر کوئی چیز وزن رکھتی ہے تو وہ صرف تقویٰ ہے۔

انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے، سعی اور کوشش کی جگہ ہے ،احتیاط اور نرمی کی جگہ ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رہنے بسنے کے آداب شرح و بست کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں، رشتے داروں کے حقوق، پڑوسی کے حقوق، غریبوں مسکینوں کے حقوق، بے سہارا اور مجبوروں کے حقوق، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، الغرض حقوق العباد کا ایک پورا نظام ہے جو وضع کر دیا گیا اور اللہ کے احکامات میں اِن کی بہت اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بتایا کہ یہ زندگی مختصر ہے، اِس کو اِس طرح گزارو کہ خود کو اللہ کی نافرمانی سے محفوظ رکھ سکو اور آخرت دار الجزا ہے نیکی اور بدی اچھے اور برے عمل کے پھل کی جگہ ہے۔ انسان کو موت کی گھڑی تک مہلت ہے جونہی سانس رکی مہلت عمل ختم ہو گئی اور انسان یا بدقسمتوں میں جا شامل ہوا یا خوش قسمتوں کا ساتھی بن گیا۔ بدقسمتوں میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے اللہ کا انکار کیا۔ اُس کی رحمت سے منہ موڑا ہے، اپنی خطاؤں کی معافی نہیں مانگی۔

اپنی زندگی میں ایک نگاہ دوڑائیں، اپنے ارد گرد دیکھیں، بازاروں گلیوں اور شاہراہوں پہ نگاہ کریں۔ اپنے گھر میں جھانکیں اور اس بات پہ غور کریں کہ ایک مسلمان کا گھر ہونے کے باوجود فکر آخرت کا معیار کیا ہے، حیَّ الفلاح حیَّ الفلاح کی آواز پر آپ کے بچے بستر چھوڑ دیتے ہیں ،اللہ واکبر کی آواز سے لوگ مسجد کی طرف جاتے ہیں یا ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ صبح کو قرآن حکیم کی تلاوت کی جاتی ہے یا اُسے ریشمی خلاف میں لپیٹ کر بچوں کی پہنچ سے دور اوپر کی الماری میں رکھ دیا گیا ہے اور صرف رمضان کو ہی اتارا جاتا ہے۔ اپنے عقیدے کی اصلاح کے لیے قرآن و حدیث سے دلچسپی ہے یا سارا وقت دوکان یا دفتر کی نظر ہو جاتا ہے۔ آپ کے رشتے دار آپ سے راضی ہیں یا اُن کو آپ کی ذات سے گلہ ہے، آپ کے والدین آپ کو دعائیں دیتے ہیں، گزرتے وقت کا احساس، موت کی آتی چاپ اور روزِ محشر کی تیاری

کے سلسلے میں تنہائی میں کبھی غور کیا ہے یا نہیں۔ یہ اور اس جیسے چند سوالات خود سے کرنے پر انسان جان جاتا ہے کہ وہ اُس عظیم الشان دن کو سرخسرو ہوگا یا شرمندہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں روزِ محشر کی شرمندگی سے بچائے۔ یاد رہے کہ روزِ محشر کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے اور یہی اسلام کا تصورِ فلاح ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ :

قُلْ إِنَّ صَلاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانعام 6/162)

ترجمہ؛

”کہو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میری زندگی اور میری موت سب خدا کے لیے ہے جو رب العالمین ہے“۔

✡ ✡ ✡

اشاریہ

*1

انسان کے تہذیبی، تمدنی و مذہبی ارتقاء کے متعلق یہ مطالعہ ''کائنات اور انسان'' سے تحریر کیا گیا۔

سیّد علی عباس جلالپوری

کائنات اور انسان (ص ۔ 11)

****

*2

اِن قرآنی آیات کا ترجمہ ''تفہیم القرآن'' سے درج کیا گیا

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تفہیم القرآن

****

*3

اس مضمون کو لکھتے ہوئے سیّد علی عباس جلالپوری کی کتابیں میری نگاہ میں رہیں۔

کائنات اور انسان (سیّد علی عباس جلالپوری)

روایاتِ تمدن قدیم (سیّد علی عباس جلالپوری)

علم کی اسلامی تشکیل (خورشید احمد ندیم)

****

*4

حارث بن اسد محاسبی روافض میں سے تھا۔

مولانا عبدالرحمان کیانی۔

شریعت و طریقت (ص : 116)

****

*5

صوفی صوف سے ہے کہ موٹے اونی کپڑے کو صوف کہا جاتا تھا۔

امام ابن تیمیہ

کو کن عمری (ص : 268)

****

*6

یہ حدیث سنن ابی داؤد سے تحریر کی گئی۔

سنن ابی داؤد ابوداؤد (کتاب الادب ، باب فے الحسد)

****

*7

حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت مشکواۃ شریف سے درج کی گئی۔

مشکواۃ

(کتاب الصلواۃ ،باب القصد فے العمل)

****

*8

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں یہ روایت مسند اامام احمد بن حنبلؒ سے درج کی گئی۔

امام احمد بن حنبلؒ (مسند احمد ۔ ج ۵)

****

*9

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں حضرت عثمان بن مظعونؓ کی یہ روایت صحیح بخاری سے درج کی گئی۔

امام محمد بن عبداللہ بخاریؒ (صحیح بخاری)

****

*10

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی یہ روایت صحیح بخاری سے درج کی گئی۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم ، مسند احمد

****

*11

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں حضرت عثمان بن مظعونؓ کی یہ روایت طبقات ابن سعد سے درج کی گئی۔

طبقات ابن سعد از ابن سعدؒ

****

*12

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں حضرت کہمس الہلالیؓ کی یہ روایت طبقات ابن سعد سے درج کی گئی۔

طبقات ابن سعد از ابن سعد

****

*13

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں یہ روایت صحیح بخاری سے درج کی گئی۔

امام محمد بن عبداللہ بخاریؒ

(صحیح بخاری ۔ کتاب النکاح)

****

*14

سینٹ پال نصاریٰ کا مشہور فلسفی اور صوفی تھا جسے قرون وسطیٰ میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی

مذہب و تجدید مذہب ۔ وعظ 35 (ص ؛ 213)

****

*15

از'' انسان کامل ''

مترجم (فضل میراں ص ؛108)

****

*16

حضرت علیؓ نے زنادقہ کے ستر لوگوں کو آگ میں جلا دیا تھا۔

امام عبداللہ بن محمد بخاریؒ (صحیح بخاری ۔کتاب الستتابہ المرتدین)

فتح الباری (جلد 12 ص ؛ 238)

****

*17

منصور بن حسین حلاج کے یہ اشعار تاریخ بغداد سے تحریر کیے گئے۔

للخطیب بغدادی

تاریخ بغداد (جلد 8 ۔ ص ؛ 129)

****

*18

اس مضمون کی تشکیل کے دوران امام امین اصلاحیؒ کی کتاب ''فلسفے کے بنیادی مسائل'' اور عہد حاضر کے معروف اسلامی سکالر خورشید احمد ندیم کی کتاب ''علم کی اسلامی تشکیل'' میرے پیش نظر رہیں۔

****

*19

اس مضمون کو لکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مورخین سے استفادہ کیا گیا۔

سبط حسن ''ماضی کے مزار''

سبط حسن ''موسی سے مارکس تک''

ڈاکٹر مبارک علی ''یورپ میں بیداری کی لہر''

****

*20

اِن دانشوروں کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا۔

The life and work of Sigmund Freud.

Dr.Jons peter.

Frued,His Dream and Sex Theories.

Pro, Joseph Jastrow.

New Horizons in Psychology

Pro,Brian M.Foss.

Modern Science and the Nature of life.

Pro,Walliam Back.

Uses and Abuses of psychology.

Pro,H.J.Eysenck.

****

*21

Marx, Engels (SELECTED WORKS).

Soviet Socialist Democracy

Fundamentels of political Economy Moscow.

Lenin Selecated Works.

Aglance at Historical Materialism.

On Scientific Communism.

****

*22

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تدبر القرآن ۔ (تفسیر سورۃ النساء جلد سوم ۔ ص ؛ 51)

****

*23

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تدبر القرآن ۔ (تفسیر سورۃ النساء جلد دوم ۔ ص ؛ 425)

****

*24

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تدبرالقرآن ۔

(تفسیر سورۃ فاطر جلد ششم ۔ ص ؛ 377)

****

*25

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تدبرالقرآن ۔

(تفسیر سورۃ فاطر جلد ششم ۔ ص ؛ 377)

****

کتابیات

القرآن الحکیم

صحیح بخاری
امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ

مسلمان امتیں
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تفہیم القرآن
سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تدبر قرآن
مولانا امین احسن اصلاحیؒ

کائنات اور انسان

علی عباس جلالپوری

مقالات

سرسید احمد خان

مقالات جلالپوری

علی عباس جلالپوری

بدلتی ہوئی تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

مسلمانوں کا ہزار سالہ اقتدار

پروفیسر ارشد جاوید

سیرۃ المزمل ﷺ

افتخار احمد افتخار

قرآن اور جدید سائنس
ڈاکٹر حشمت جاہ ؒ

رسول عربی اور عصر جدید
سیّد محمد اسماعیل ؒ

علم کی اسلامی تشکیل
خورشید احمد ندیم

المسند
امام احمد بن حنبل ؒ

کیمیائے سعادت
امام غزالی ؒ

تفسیر در منثور
امام جلال الدین سیوطی ؒ

مسلمانوں کا نظم مملکت

حسن ابراہیمؒ

سود

سیّد مودودیؒ

تجدید احیائے دین

سیّد مودودیؒ

الاحکام القرآن

محمد بن احمد قرطبیؒ

مسلم نشاۃ ثانیہ

ڈاکٹر محمد امین

مسلمان اور سائنس کی تحقیق

حبیب احمد صدیقیؒ

Modren Islimic Thought.

Man God and Immortalilty.

J.G.Freezer

Modren Islimic Thought.

Sir jamees jeen

Religion Without Revolation .

J.Heksely

Origion of Species.

S, Charles Darwen

The Conquest of Happiness

B.Russal

The Mysterious Univers.

James jeans

History of Religion.

Trawleing

Das Kapital.

Karal Marx

History of civiliazation.

B, Russiall